ہمارا تعلیمی نظام

ظفر اللہ خان

ہمارا تعلیمی نظام

ظفر اللہ خان

ہمارا تعلیمی نظام

ماضی حال مستقبل

ظفر اللہ خان

الکریم مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور

©2022ءمشتاق بک کارنر،الکریم مارکیٹ،اردو بازار،لاہور
جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔ یہ کتاب یا اس کا کوئی بھی حصہ کسی بھی شکل الیکٹرانک، مکینیکل،فوٹو کاپی، ریکارڈنگ یا کسی اور ذریعہ سے مشتاق بک کارنر، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور کی باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر استعمال یا شائع نہیں کیا جا سکتا۔ حوالہ یا تبصرہ کے لیے کتاب، مصنف کا نام اور صفحہ نمبر کا اندراج ضروری ہے۔

مصنف	:	**ظفراللہ خان**
ایڈیشن	:	2022ء
اشاعت	:	دسمبر، 2022ء
تعداد	:	1000
آئی ایس بی این	:	000-000-000-000-0
قیمت	:	

مشتاق بک کارنر، لاہور کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ : https://mushtaqbookcorner.blogspot.com/ یا فون : 042-37230350
یا ای میل :

297 خان، ظفراللہ
خ ا ن ہمارا تعلیمی نظام: ماضی، حال، مستقبل/ظفراللہ خان۔
لاہور: مشتاق بک کارنر، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، 2022ء
236 ص۔
کتابیات
آئی ایس بی این:

1۔اسلام 2۔اجتہاد 3۔ نشاۃ ثانیہ 4۔عنوان 5۔ مصنف

فہرست مضامین

تعارف

1

اسلامی علوم کی اخلاقی بنیادیں

اسلام، انسانیت کے لیے فرداً فرداً اور ان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے بھی خدا کی طرف سے آخری ہدایت ہے۔ اس کے امن وسلامتی اور خوشحالی کے پیغام نے 1400 سال سے زائد عرصہ پہلے ایک پاکیزہ اور پُر جمال و پُر جلال امّت کی تشکیل کی۔ مسلمانوں نے ایک شاندار اور بے مثل تہذیب کی تخلیق کی جس نے انسان کی زندگی، اس کے علم اور اس کے ارتقا کی سرحدوں کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔ یہ امّت تقریباً ایک ہزار برس تک بنی نوعِ انسان کے لیے روشنی کا مینار بنی رہی۔ دنیا اس عظیم الشان تہذیب وتمدن، اس کی وسعت پذیر ذہنی استعداد اور قوتِ عمل کو نگاہِ حیرت سے دیکھتی رہی مگر یہ سلسلہ اس شان وتمکنت کے ساتھ جاری نہ رہ سکا۔

اسلام نے تمام شعبہ ہائے حیات میں رہنمائی کر کے انسان کو بے شمار فوائد سے ہمکنار کیا۔ اسلامی سکالرز نے تخلیقی ذہانت کو بروئے کار لا کر کارہائے نمایاں کرنے کے علاوہ قدیم یونانی اہل دانش کے بیشتر اہم سائنسی اور فلسفیانہ متون کو بھی عربی تراجم کے ذریعے محفوظ کر لیا۔ مسلمان دانشوروں نے یونانی علوم کے ڈھانچے اور ساخت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں متعدد ایسے اہم اضافے کیے جو رومن عہد میں بھی برقرار رہے۔ مسلمانوں نے بارہویں اور تیرہویں صدی میں ان تصانیف کے بیشتر حصے کا لاطینی زبان میں جو ترجمہ کیا اس نے یورپی نشاۃِ ثانیہ کی بیداری میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کے واقعات اس امر کے گواہ ہیں کہ مسلمانوں کے علوم وفنون بڑے پیمانے پر تراجم کے ذریعے مغرب میں مقبول ہو رہے تھے۔ جب اسلامی دنیا میں حالات خراب ہوئے تو ان تراجم نے ہی یورپ کو مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے میں ان کی مدد کی۔ امریکی مؤرخ اور فلاسفر وِل ڈیورانٹ کے مطابق 700ء سے 1200ء تک پانچ صدیوں کے دوران اسلام دنیا کو قوت واقتدار، نظم وضبط، طرزِ حکمرانی، آدابِ معاشرت، علم وفضل اور فلسفے کے فروغ میں رہنمائی فراہم کرتا رہا۔

انسانی تہذیب پر اسلام کے اثرات کو اخلاقی اثرات اور علمی اثرات میں منقسم کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اسلام کے علم اخلاق اور عمومی علمی احسانات دونوں حصوں کا محتاط تجزیہ،

اسلامی ثقافت کی ترقی و برتری کے حقائق سامنے لاتا ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ اسلام کا علم الاخلاق تمام علوم کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی خاص تشکیل کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی نظام الاخلاق ایک خاص نقطہ نظر دیتا ہے جس کی روشنی میں درتمام علوم تشکیل پاتے ہیں۔

زندگی بہت اہمیت رکھتی ہے اوراس کی اقدار اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اقدار رہنما اصول یا طرز عمل کا معیار ہیں جنہیں ایک مہذب اور منصف معاشرہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ وہ اصول ہیں جنہیں ہم دیگر افراد کے ساتھ، اپنے دوستوں کے ساتھ اور اپنے خاندان کے ساتھ تعامل کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ ان بستیوں اور گروہوں کے ساتھ بھی ہمارے طرز عمل کی رہنمائی کرتے ہیں جن میں ہم رہتے ہیں۔ جن کے ہم ممبرز ہیں۔ جن کے ساتھ ہم تجارت کرتے ہیں اور ایک پیشہ ورانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اخلاقیاتی اقدار، اخلاقی معیاروں، اخلاقی ذمہ داری اور اخلاقی شناخت کے تصورات کی حامل ہوتی ہیں۔ اخلاقی معیارات، طرز عمل کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ اخلاقی ذمہ داری ہمارے ضمیر کا حوالہ دیتی ہے اور اخلاقی شناخت اس امر کا حوالہ دیتی ہے کہ کون صحیح یا غلط اقدام کرنے پر قدرت رکھتا یا رکھتی ہے۔ جب ان خیالات کی انسانوں کے ساتھ تجسیم کی جائے تو وہ مندرجہ ذیل کے کام کرتے ہیں:

- افراد کے مابین معقول رویے اور ہم آہنگی کی ضمانت دیتے ہیں۔
- ہمیں اچھے لوگ بننے میں مدد دیتے ہیں تا کہ ہم ایک اچھا معاشرہ تشکیل دے سکیں۔
- ہمارا اس قادر مطلق کے ساتھ اچھا تعلق قائم کراتے ہیں جس نے ہمیں تخلیق کیا۔

اخلاقیاتی اقدار زندگی کے ہر فلسفے کا جوہرِ حقیقی ہیں۔ ایک چینی محاورہ ہے کہ اگر دل میں سچائی ہو تو کردار میں حسن پیدا ہو جائے گا۔ اگر کردار میں حسن ہو گھر میں یگانگت پیدا ہو جائے گی۔ گھر میں یگانگت ہو گی تو قوم میں نظم و ضبط پیدا ہو جائے گا۔ جب قوم میں نظم و ضبط ہو گا تو دنیا میں امن ہو جائے گا۔

اسلام نے انسانی زندگی میں اقدار کی غیر معمولی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ اس نے نہ

صرف سابق مذاہب کی پیش کردہ اخلاقی اقدار کی توثیق کی ہے بلکہ ان میں گہرائی اور حُسن کا اضافہ بھی کیا ہے۔اس نے ان کے لیے روحانی بنیاد فراہم کی اوراعلیٰ وارفع اقدار کے لیے فطری و تخلیقی تحرک بھی فراہم کیا۔ اسلام نے انسانی نفسیات کو گہرائی میں جا کر چھیڑا ہے تا کہ اسے نہ صرف غصے، حسد، حرص اور دیگر منفی انسانی صفات کے تاریک سایوں سے صاف کیا جا سکے بلکہ صبر، محبت، رحم، ایثاراور ذاتی وقار کی روشنی سے منور بھی کیا جا سکے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام انسانی صفات طالب علموں میں پیدا کر رہا ہے کہ نہیں؟ اگر ہمارا نظام تعلیم یہ صفات طالب علموں میں پیدا کر رہا ہے تو صحیح وگرنہ ہم اپنے کام میں ناکام ہوئے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ہم اس میں کامیاب نہیں ہوئے وگرنہ ہمارا معاشرہ بہت خوبصورت، مفید اور انسان دوست ہوتا۔

(1) معرفت

انسان کو خدا اور اس کی صفات سے آگاہی حاصل ہونے، زندگی کی ابتدا اور انتہا کا گہرا شعور حاصل ہونے اور صحیح زندگی گزارنے کا واضح لائحہ عمل معلوم ہونے سے حقیقت کا وجدانی علم حاصل ہو گیا۔ بنی نوع انسان کو کسی اور فلسفے یا دین کی تلاش کے لیے غیر متعلقہ اور لا حاصل کوششوں سے نجات دلا دی۔اس کی قوت اور توانائی ضائع ہونے سے محفوظ ہو گئی۔اس طرح اسے بلند مقاصد کے حصول کی جدوجہد کے لیے وافر وسائل دستیاب رہے۔مسلمانوں نے اپنی ان توانائیوں کو اپنے دنیا کے مسائل اور دینی امور کی تکمیل کے لیے استعمال کیا اور ایک حیرت انگیز تہذیب پیدا کر لی جس نے اس کی اخلاقی قدروں اور مادی سہولتوں کو یکجا کر دیا۔

معرفت الٰہی دو قسموں کی ہے۔'علمی' (cognital) اور 'حالی' (emotional) اول الذّکر یعنی 'علمی معرفت' اس دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کی بنیاد ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن پاک فرماتا ہے:

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ [1]۔

(نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کو فائدہ دیتی ہے)

---

[1] سورۃ الذاریات، آیت:55

معرفت اللہ تعالیٰ کے ذریعے زندگی ہے۔ یہ اپنے انتہائی داخلی خیالات کو اللہ تعالیٰ کے سوا (غیر اللہ) سے ہٹا لینے کا نام ہے۔ ہر شخص کی قدر و قیمت اسے حاصل معرفت کے تناسب سے ہے۔ جسے معرفت حاصل نہیں وہ بالکل ناچیز ہے۔ معرفت، دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلوب انسانیت کے لیے روحانی روشنی کی ترسیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ازراہِ عنایت و کرم انسان کے دل کو منور کر دیتا ہے اور اس کو مخلوق کی آلائشوں سے صاف رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے دل میں ان چیزوں کی قیمت رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں[1]۔

عجب آن نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است[2]
(عجب یہ نہیں ہے کہ آپ مسیحاؑ کی طرح بیماروں کو ٹھیک کرنے کا اعجاز رکھتے ہیں)
(عجب بات تو یہ ہے کہ تیرا بیمار اور زیادہ بیمار ہو جاتا ہے)

(2) قبول اطاعت

اس پاکیزہ فکر نے انسان کو مکمل سپردگی عطا کی۔ اپنی ذاتی خواہشات سے دستبردار ہو کر وہ اللہ تعالیٰ کے غلام بن گئے۔ اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیا۔ جنگ اسی کے لیے، صلح اسی کے لیے۔ محبت اسی کے لیے۔ نفرت اسی کے لیے۔ ایمان کا ایک لمحہ ان کی کایا پلٹ دیتا تھا۔ اچھی چیز بری بن جاتی تھی۔ بری چیز اچھی بن جاتی تھی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے۔ فضالہ بن عمیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کے ارادے سے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فضالہ کیا کرنے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ کچھ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس کے سینے پر رکھا۔ فضالہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ جیسے ہی سینے

[1] کشف المحجوب، ص:255
[2] پیام مشرق: پیام

سے اٹھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ کو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبوب۔ واپسی پر مجھے وہ عورت ملی جس سے دل لگی کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ آؤ باتیں کریں۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے[1]۔

(3) اخلاقی جرأت

روحانی جرأت نے ایک مومن کو روحانی شعور اور غیر معمولی قوتِ ارادی عطا کر دی اور اسے محاسبۂ نفس کے تصور سے بھی مسلح کر دیا ہے تا کہ وہ اپنی غلطیوں اور ناکامیوں کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔ یہ ایک مسلسل مشق کا عمل ہے۔ اسے 'نفسِ لوامہ'[2] کہا جاتا ہے۔ (یہ ہمیشہ توبہ کرتے رہنے کا شعور ہے)۔ جب بھی مومن سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے، یہ اسے کچوکے لگاتا ہے اور اسے تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے بھی برائی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ اس شعور نے لوگوں کو اس بات کے لیے بھی تیار کر دیا کہ وہ اعتراف گناہ کر کے خود کو سزا کے لیے پیش کر دیں۔ اس محاسبۂ ذات نے ان میں اخلاقی جرأت پیدا کر کے راست بازی اور لائق بھروسہ ہونے کے اعلیٰ ترین معیارات قائم کر دیئے۔ اس طرح لوگوں میں ایسا تقویٰ اور حسنِ اخلاق پیدا ہوا جو نجی زندگی اور باہر کے معاملات میں ہر جگہ یکساں طور پر موجود رہا۔ چنانچہ انسانوں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری قوتوں کے سامنے سر جھکائیں۔ بادشاہ، علماء اور رؤساء سب نے اللہ تعالیٰ کی عاجز مخلوق جیسے رویئے اپنا لیے۔ اللہ پاک کی عظمت اور جلالت نے بنی نوع انسان کو ان سب زمینی خداؤں کے شکنجے سے آزاد کرا دیا۔ تمام دنیاوی حُسن اور شاہی درباروں کی شان و شوکت اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے ماند پڑ گئی۔

تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ عرب فاقہ کش قیصر و کسریٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رستم ایران (ایران کا سپہ سالار) کے پاس حضرت

---

[1] زاد المعاد، ج:2، ص:232

[2] انسانی ضمیر جو انسان کو غلط کاموں پر ملامت کرتا ہے، نفس لوامہ کہلاتا ہے۔

ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جب وہ رستم کے دربار میں پہنچے تو دربار سجا تھا۔ تاج وتخت تھا۔ ریشم وحریر تھا۔ یاقوت ومرجان تھے۔ یہ اللہ والا غربت کے ہاتھوں تنگ تھا۔ مختصر سا لباس تھا۔ نیم مردہ سا گھوڑا تھا۔ محل میں وہ گھوڑے سے نہیں اترے۔ مخمل وکمخواب (velvet) کے فرش پر چلتے گئے۔ حتیٰ کہ گھوڑے کو دربار کے گاؤ تکیہ سے باندھ دیا۔ نیزے کو فرش پر مارتے مارتے رستم تک پہنچے[۱] ارشاد فرمایا:

ہم کو اللہ پاک نے اس لیے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر اسلام کے عدل میں لے آئیں[۲]۔

اعلیٰ ترین راستبازی، دنیاوی مال ومتاع سے بے اعتنائی، اللہ تعالیٰ سے محبت اور آخرت کی تمنا نے مسلمانوں کو حق گو اور جرأت مند بنا دیا۔ وہ جنت کی محبت سے سرشار تھے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا کی زندگی اور اس کی مادی اشیا کو حقارت ونفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہیں اسلام کے اعلیٰ تصورات اتنے مرغوب تھے کہ وہ گردوپیش کی دنیا سے بے گانہ ہو گئے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّت آشنائی[۳]

(4) شخصی وقار

نفسیاتی اور اخلاقی عوامل نے انسانی طرز عمل اور رویوں کو نئی تبدیلیوں سے آشنا کر دیا۔ بنی نوع انسان کو حیاتِ نو مل گئی اور اس کی عزت واحترام بحال ہو گیا۔ ایک عظیم انسان دوست انقلاب نے عرب قوم کی کایا پلٹ کر رکھ دی جو اس وقت تک انتہائی پسماندہ اور جاہل قوم شمار ہوتی تھی۔ عمر

---

[۱] تاریخ الامم والملوک، ج:2،ص:701

[۲] تاریخ الامم والملوک، ج:2، رقم الحدیث:702

[۳] بال جبریل: طارق کی دعا

جو ایک چرواہا ہوتے تھے اس تعلیم اور تربیت کی بدولت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن گئے اور اپنی غیر معمولی شخصیت کی وجہ سے دنیا کو حیران کر دیا۔تقویٰ اور انتظامی قابلیت کے لیے وہ ایک نمونۂ عمل بن گئے۔خالد بن ولید ایک عام نوجوان تھے جنہوں نے بعد میں روم فتح کیا اور سیف اللہ کہلانے لگے۔حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نہایت نرم دل انسان تھے لیکن انہوں نے ہرقل کو شام سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایک عام دانش مند انسان تھے وہ گورنر مصر بن گئے۔حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایک عام آدمی تھے جنہوں نے جنگ مدائن میں عراق اور ایران، دونوں کو فتح کر لیا۔حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو ایک غلام خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے ملک ایران کے حکمران بن گئے لیکن ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک چھوٹے قد کے آدمی تھے ایک عالم اور قانون دان بن گئے جو اگلی نسلوں کے لیے علم و دانش کا منبع قرار پائے۔

یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کیسے ہوا؟ ایسا لگتا ہے جیسے کہ دعوت اور عشق کی تاریں پھیلا دی گئیں۔ان میں ایمان کی برقی رو آ گئی۔ یہ رو اہل ایمان کے جسد میں دوڑ گئی جس سے مردہ دل زندہ ہو گئے اور جلد ہی پوری دنیا اس کے جلوے سے منوّر ہو گئی۔ یہ عظمت و قوت بنی نوع انسان پر اسلام کا ایک احسانِ عظیم تھا۔اس نے افراد اور قوموں کو انقلاب سے آشنا کیا۔چرواہوں کو حکمران بنا دیا۔انسانی زندگی کی کایا پلٹ گئی اور چرواہے عام حکمران نہیں بلکہ غیر معمولی اور مثالی حکمران بن گئے۔

ان کے علاوہ دیگر عظیم لوگوں نے بھی امتِ مسلمہ کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ انصاف اور سچائی کے علمبردار بنے۔ان کی ذاتی خواہشات اور عبادت و ریاضت نے انہیں عدل گستری کے فریضے سے غافل نہیں ہونے دیا۔ وہ بنیادی فوائد سے دور رہے اور حصولِ اقتدار کے کبھی متمنی نہ ہوئے۔تاہم جب انہیں سرکاری منصب کی ذمہ داری قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو انہوں نے اسے ایک مقدس امانت سمجھا۔ وہ کسی خاص نسل یا علاقے کی نمائندگی نہیں کرتے تھے بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی میں دلچسپی رکھتے تھے اور

انہوں نے انسانی وقار اور احترام کا علم بلند رکھا۔

(5) اجتماعی ذمہ داری

اسلامی شعور واحساس نے اجتماعی ذمہ داری کا تصور دیا ہے۔اسلام اور بیشتر دیگر مذاہب میں فرق یہ ہے کہ اس نے صرف عبادات کرنے اور معاشرتی ذمہ داریاں دنیاوی حکمرانوں پر چھوڑ دینے کا حکم دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے طریق ہائے عمل، باہمی تعلقات، فرد بمقابلہ خاندان ومعاشرہ وقوم اور مابین اقوام، حقوق اور ذمہ داریوں کا بھی احساس دلایا ہے۔قرآن مجید اعلان کرتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[۱].

(اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں)

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ[۲].

(تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو آخرت کی جزا وسزا کو جھٹلاتا ہے۔وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا)

حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مومن بندوں کی مثال ان کی آپس میں محبت اور اتحاد اور شفقت میں جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کے اعضاء میں سے کسی عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس کے سارے جسم کو نیند نہیں آتی اور بخار چڑھ جانے میں اس کا شریک ہو جاتا ہے[۳]۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے اس بنیادی امتیاز کو واضح کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: آگاہ

---

[۱] سورۃ التوبہ، آیت: 71

[۲] سورۃ الماعون، آیت: 1-2

[۳] صحیح مسلم، ج: 3، رقم الحدیث: 2085

رہو! تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ پس وہ امیر جو لوگوں پر نگہبان بنایا گیا ہے (روز قیامت) اس سے لوگوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے مکان اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے[۱]۔

حضور نبی کریم ﷺ نے اس فرض کی ایک بڑی خوبصورت وضاحت کی ہے کہ معاشرہ ہر ایک فرد کے رویئے کے بارے میں جوابدہ ہے۔ ارشاد مبارک ہے کہ اس شخص کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم ہے اور اس شخص کی جو اللہ تعالیٰ کی حدود میں پڑنے والا (اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ورزی کرنے والا) ہے۔ اس قوم کی سی ہے جو ایک جہاز میں بیٹھے ہوں۔ قرعہ سے جہاز کی منزلیں تقسیم کر لی جائیں۔ کچھ لوگ اوپر والی منزل میں ہوں اور کچھ نیچے والی منزل میں ہوں۔ جب نیچے والوں کو پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ جہاز کے اوپر والے حصے میں جا کر پانی لیتے ہیں۔ اگر وہ یہ خیال کر کے کہ ہمارے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اپنی نچلی منزل میں ایک سوراخ سمندر میں کھول لیتے ہیں تا کہ پانی لے سکیں۔ اگر اوپر والے نیچے والوں کو اس احمقانہ تجویز سے نہیں روکیں گے تو جہاز غرق ہو جائے گا اور دونوں گروہ ڈوب جائیں گے۔ اگر ان کو روکیں گے تو دونوں بچ جائیں گے[۲]۔

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کریں۔ مظلوم کی مدد اس طرح کہ اسے تشدد سے بچا لیں اور ظالم کی مدد اس طرح کہ اسے ظلم کرنے سے باز رکھیں۔ حضور نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہے یا مظلوم ہے۔ لوگوں نے پوچھا: اے

---

[۱] سنن ابوداؤد، ج:2، رقم الحدیث:1161

[۲] صحیح بخاری، ج:1، رقم الحدیث:2393

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! اگر وہ مظلوم ہے تو اس کی مدد کرنا صحیح ہے۔ ہم ایک ظالم کی مدد کس طرح کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسے دوسروں پر ظلم کرنے سے روک کر ا۔

(6) عشق کا نقطۂ ارتکاز

بنی نوع انسان نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں اپنے لیے ایک 'رول ماڈل' (عملی نمونہ) پا لیا تھا جو ان کی دائمی محبت وعقیدت کا مرکز تھا۔ محبت ایک ملکوتی جذبہ اور ایک تند و تیز قوت ہے جو اس مادی دنیا میں ہزاروں طریقوں سے اپنا اظہار کر لیتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اپنا ایک تاثر نہ رکھتی ہو۔

یہ جذبۂ عشق دنیاوی جاہ وحشمت اور چمک دمک میں گم ہو گیا۔ انسانیت صدیوں ایک ایسے انسانی پیکر سے محروم رہی جو اس کی محبت وعقیدت کا مرجع و مرکز بن سکتا تا وقتیکہ اسے حُسن، قوت و وقار کا نمونۂ کامل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں دکھائی دے گیا۔ جو بنی نوع انسان کی توجہ اور محبت کا نقطۂ ماسکہ بن گیا تھا۔ جس کسی نے اسے دور سے دیکھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کے سحر سے مرعوب و مغلوب ہو گیا اور جب اس نے قریب آ کر شرف ملاقات حاصل کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شیدا بن گیا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ کی ایک شاندار نعت کے اشعار درج کروں جو میری رائے میں حقیقت کے قریب تر ہیں:

بَلَغَ	العُلیٰ	بکمَالِہِ
کَشَفَ	الدُجیٰ	بجمالِہِ
حَسُنَت	جمِیع	خِصَالِہِ
صَلُوا	عَلیہِ	وآلِہِ

(انسانی عظمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں اپنے کمال تک پہنچی)

---

[1] صحیح بخاری، ج:3، رقم الحدیث:1879

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن و کمال کی روشنی سے اندھیرے چھٹ گئے)
(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تمام اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں)
(اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل پر سلام بھیجتے ہیں)

مرزا غالب نے بھی خوب کہا ہے:

حق جلوہ گر زطرزِ بیانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
(حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں ذات خداوندی جلوہ گر ہے)
(واقعی کلام حق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوتا ہے)

غالب ثنائے خواجہ بہ یزدان گزاشتم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
(غالب ہم حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑتے ہیں)
(اس لیے کہ صرف وہی ذات ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ جانتی ہے)

ایک انصاری عورت جس کا باپ، بھائی اور شوہر احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے اور شہید ہو گئے تھے۔ اسے خبر ملی تو وہ اپنے بیٹوں کی بجائے گھر سے نکل کر پوچھنے لگی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ اس نے کہا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس نے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ لیا تو بولی: اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلامت ہیں تو دنیا کی ہر مصیبت ہیچ ہے[1]۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا۔ سب کہنے لگے کہ کہو یہ پسند ہے کہ (**نعوذ باللہ**) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہاری جگہ ہوں؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا

---

[1] شرح حدیث، مشکوٰۃ المصابیح، ج:1، رقم الحدیث:6

کہ آپ ﷺ کے پاؤں مبارک میں کانٹا بھی چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں۔ وہ سب ہنس دیئے[۱]۔
حضرت عروہ بن مسعود ثقفی (کفار مکہ کا سفیر) نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا: اے لوگو! خدا کی قسم، میں نے بہت سے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں۔ نجاشی[۲] کا دربار بھی دیکھا ہے۔ خدا کی قسم! میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہیں جتنی محمد ﷺ کے ساتھی محمد ﷺ کی۔ خدا کی قسم! جب وہ تھوکتے ہیں لوگ اس کو اپنے جسم پر مل لیتے ہیں۔ جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے لڑتے رہ جاتے ہیں۔ جب بات کرتے ہیں تو لوگ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ فرط ادب سے آپ ﷺ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے[۳]۔

انسانیت کے اپنی محبت کے اظہار کے لیے ایک نقطہ مل گیا تھا۔ جہاں وہ اپنے اعلیٰ جذبات قربان کر سکتے تھے۔ فطری جذبے کی تسکین کر سکتے تھے۔ جذباتی انتشار سے بچ گئے۔ پاکیزگی اور لطف و عنایت نے ایک عمدہ شکل دیکھی۔ محبت و اطاعت کی نئی روایات قائم ہوئیں۔ محبت کے تخلیقی عمل سے کمالات نے جنم لیا۔ محبت فاتح عالم بنتی چلی گئی۔ محمد اقبالؒ نے کیا صحیح ارشاد فرمایا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے[۴]

(مسلمانوں کا رہنما وہ شخص ہو سکتا ہے جس کی نگاہ بلند ہو۔ جس کا سخن دلنواز ہو۔ جان پرسوز ہو یعنی وہ عشق رسول ﷺ میں فنا ہو چکا ہو)

---

[۱] تاریخ الامم والملوک، ج:4، ص:63
[۲] نجاشی زمانہ قدیم میں حبشہ موجودہ ایتھوپیا کے بادشاہ کا لقب تھا۔
[۳] زاد المعاد، ج:2، ص:125
[۴] بال جبریل: غزل

(7) خوف خدا

اسلامی انقلاب کا انسانی وجود کے نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں پر گہرا اور دائمی اثر ہوا تھا۔ اسلام سے پہلے فلسفے اور مذہب نے انسانی زندگی پر کوئی زیادہ گہرا اثر نہیں ڈالا تھا۔ عمومی بات کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ انفرادی اور معاشرتی زندگیاں مذہب یا فلسفے سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی تھیں۔
زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کائنات کو تخلیق کرنے کے بعد دنیاوی معاملات سے لاتعلق اور لا پرواہ ہو گیا ہے۔ ان کے دل یا تو خدا کے خوف اور محبت سے خالی ہو گئے تھے یا خدا کا خوف اور محبت ان کی زندگیوں کو سنوارنے کے لیے قابل عمل تخلیقی قوتیں نہیں تھیں۔ یونانی فلسفے کی زیادہ تر تعلیمات میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں ایک منفی تصور پایا جاتا تھا اور وہ کبھی کبھار ہی خدا کی بے پایاں محبت، رحم اور معافی کا ذکر کرتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بے ہنگم تصورات اور غیر صحت مند رویوں پر کسی مثبت ثقافت و تہذیب کی عمارت نہیں کھڑی کی جاسکتی۔
اسلام نے بنی نوع انسان کو یونانی فلسفے کی مہلک معلومات اور بیمار و لاغر عرفان (Gnosticism) سے نجات دلا کر ایسے خدا سے متعارف کرا دیا جو جسم و روح میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ خون کے ہر قطرے کے اندر محسوس ہوتا تھا۔ اسلام کا خدا نہایت مہربان اور رحم کرنے والا۔ رزق دینے والا۔ حفاظت کرنے والا۔ سلامتی عطا کرنے والا۔ اور جل جلالہٗ کی شان رکھتا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے اندر اس کی صفات پیدا کریں۔ خود کو اس کے رنگ میں رنگ لیں کیونکہ وہ بہترین رنگ رکھتا ہے[1]۔
تصور یہ ہے کہ خدا پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ وہی قطعی طور پر اس کو چلاتا ہے اور یہ کہ اسی نے شعورِ زندگی عطا کیا ہے اور وہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ خدا پر ایمان لانا انسانی زندگی کے لیے لازمی اور خلقی ہے۔ یہ ایمان ان کی رگوں میں حیات آفریں خون کی طرح گردش کر رہا ہے اور ان کے دل و دماغ کو منور کر رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک متقی و پرہیزگار اور باوقار تصور انسانیت

[1] سورۃ البقرۃ، آیت:138

ابھرا ہے، جوان کے شعور اور محبت کے اندر سرایت کر گیا ہے۔ قرآن اس کا اظہار یوں کرتا ہے۔

(ا) وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى[۱].

(اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا)

(ب) اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا[۲].

(صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں)

(ج) اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[۳].

(درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی شعور کی وضاحت فرمائی، جب ایک بار ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کچھ نصیحت فرمائیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ یہ ہر چیز کا منبع ہے۔

(8) تمنّائے موت

غزوہ احد میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ شریک تھے۔ ایک موقع پر دشمن کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو سامنے دیکھا تو فرمانے لگے کہ

اے سعد (رضی اللہ عنہ)! خدا کی قسم جنت کی خوشبو احد پہاڑ کے اس طرف سے آرہی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے اسی (80) سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے۔ جسم ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی کوئی شناخت نہ کرسکا۔ ان کی بہن نے ان کی انگلی کے پور سے شناخت کیا[۴]۔

غزوہ بدر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بڑھو! اس جنت کی طرف جس کی وسعت

---

[۱] سورۃ النازعات، آیت:40

[۲] سورۃ فاطر، آیت:28

[۳] سورۃ الحجرات، آیت:13

[۴] صحیح بخاری، ج:2، رقم الحدیث:79

زمین و آسمان ہے۔تو حضرت عمر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس کی وسعت زمین و آسمان ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں! کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میری تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! ہاں! آپ اس کو پالو گے۔ وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے۔ پھر فرمانے لگے: اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا۔ پھر تمام کھجوروں کو پھینک دیا اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی[۱]۔

موت کے آئنے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے[۲]

---

۱ سنن کبریٰ للبیہقی، ج:9، رقم الحدیث:4071
۲ ضربِ کلیم: امامت

2

انسانیت پر اسلام کے علمی احسانات

اسلام نے اپنے ظہور کے وقت، پہلے سے موجود علمی دنیا کی کایہ پلٹ دی۔ اس کی اعلیٰ عقلی فکر نے ایک عظیم الشان علمی رجحان پیدا کیا جس نے ایک نئی علمی فکر کو جنم دیا۔ اس تہذیب نے یونان، ہندوستان، روم اور مصر کی عظیم علمی روایت کو بھی آگے بڑھایا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے ایک غیر معمولی تہذیب کو جنم دیا اور پھر انسانی دنیا پر غیر معمولی احسانات کرتے ہوئے علم کو جدید دنیا میں منتقل کر دیا اور یہ سب کچھ ہمارے نظام تعلیم و تحقیق کے باعث ممکن ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کیا آج کا نظام تعلیم ایسا کر رہا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

(1) سائنسی فکر

سائنسی فکر کا مطلب تحقیق کے انضباطی طریق کار کا اطلاق ہے جو معروضی اور مقصدی اور اصولی طریقوں پر مبنی ہو۔ اسے علم کی نئی شاخوں کی تخلیق اور اس عمل کی تسہیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تحقیق کا ایک منظم طریقہ ہے جو فطرت کے محتاط مشاہدے اور سوچ بچار سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ عقلِ خداداد قرآنی تحریک برائے علمی تحقیق کا ساتھ دیتی ہے۔ قرآن مجید نے اس اسلامی مقصد کی طرف پیش قدمی کے لیے طریق کار کی تشکیل نو کی طرف دعوت ایسے دی ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ[۱].

(اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے سب کو پیدا کیا)

یہ وہی وحی ہے جو اعلان کرتی ہے کہ ساری 'تخلیق کردہ' دنیا کا مطالعہ کرنا 'خالق' کی معرفت حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ فطرت تک رسائی کے لیے اس نئے طریق کار نے مسلمانوں کو راز ہائے فطرت کی بصیرت حاصل کرنے کے لیے ایک تخلیقی قوت فراہم کر دی ہے۔ قرآن مجید انسانی ذہانت کو مظاہر فطرت کی گہری بصیرت حاصل کرنے کا نہ صرف جذبہ عطا کرتا ہے بلکہ اسے مختلف اسلوب ہائے فکر اور استدلال کے مختلف انداز بھی فراہم کرتا ہے۔ قرآن پاک کے نقطۂ نظر سے

---

۱ سورۃ العلق، آیت: 1

فطرت اللہ تعالیٰ کی ایک واضح نشانی (آیت) ہے جو اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ ایک مرتب نظام کی نشاندہی کرتی ہے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ[1].

(بیشک آسمان اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے لگا تار آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لیکر سمندر میں تیرتی ہیں، اس پانی میں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں)

قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوۡنَ[2].

(کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟)

اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ[3].

(کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟)

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ كَیۡفَ خُلِقَتۡ ۞ وَاِلَی السَّمَآءِ كَیۡفَ رُفِعَتۡ ۞ وَاِلَی الۡجِبَالِ كَیۡفَ نُصِبَتۡ ۞ وَاِلَی الۡاَرۡضِ كَیۡفَ سُطِحَتۡ[4].

(تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے بلند کیا گیا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے نصب کیا گیا ہے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ یہ کس طرح

---

[1] سورۃ البقرۃ، آیت:164

[2] سورۃ الانعام، آیت:50

[3] سورۃ البقرۃ، آیت:44

[4] سورۃ الغاشیہ، آیات:17-20

بچھائی گئی ہے)

قرآن پاک کے پیدا کردہ تجسس نے قرونِ اولیٰ کے ذہین مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی تخلیقی فکر کو صحیح معنوں میں بروئے کار لائیں۔ ان میں یہ تخلیقی فکر اور طریقۂ کار ان کی طبع زاد کتابوں میں جو انہوں نے لکھیں اور تراجم میں جو انہوں نے کیے اور قدیم یونانی، ہندوستانی اور ایرانی تہذیبوں کے سائنسی ورثے کے تحفظ میں، جس کا انہوں نے اہتمام کیا، صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی کاوشیں دو نمایاں تخلیقی طریق ہائے کار میں ظہور پذیر ہوئیں جنہوں نے بنی نوع انسان کی مستقبل کی پیش رفتوں میں بے پناہ کردار ادا کیا۔ ایک تو انہوں نے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ایجاد کی اور دوسرا یہ کہ انہوں نے تخلیقی اور تجزیاتی ذہنوں کی آبیاری کی۔

مسلمانوں نے تمام قوموں کی مثبت اور تخلیقی کاوشوں کا خیر مقدم کیا، انہیں سمجھا اور جانا اور پھر ان کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کے تصورات کو اسلامی عالمی تناظر کے ڈھانچے میں ضم کر لیا۔ فلپ ہٹی[1] رقم طراز ہے:

اسلام کی وحدانیت اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی استعداد کے باعث انسانی فکر میں پہلی بار ثابت ہوا ہے کہ دینیات، فلسفہ اور سائنس بالآخر ایک اکائی کے طور پر متحد ہو گئے تھے۔ اس طرح ان کا یہ کارنامہ بہت اہم تھا کیونکہ اس نے سائنسی اور فلسفیانہ فکر اور بعد کے زمانے کی دینیات پر بہت اثرات مرتب کیے۔ یہ سائنس کے ارتقا کے اسباب میں سے ایک ہے۔ غالباً یہ خدا کے ان احکامات کی وجہ سے ہے کہ قوانین فطرت کی تفتیش کی جائے[2]۔

اسلام کی آمد سے پہلے لوگ اشیائے فطرت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسے 'شرک' قرار دے دیا (اس کا مطلب خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا ہوتا ہے) اور اپنے

---

[1] Philip Khuri Hitti: فلپ خوری ہٹی (1886ء-1978ء) ایک امریکی مستشرق تھا جو لبنان میں پیدا ہوا۔ 1915ء میں کولمبیا یونیورسٹی کے مشرقی علوم کے شعبے میں لیکچرر مقرر ہوا۔ اس کے بعد پرنسٹن یونیورسٹی امریکا چلے گیا۔

[2] The Arabs, p. 111.

پیروکاروں پر زور دیا کہ وہ ہرگز اشیائے فطرت کو نہ پوجیں بلکہ ان کا مطالعہ کریں۔ اس حکم کے نتیجے میں سائنسی سوچ اور طریق ہائے کار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسلام سے پہلے تجربات اور مشاہدے کا کوئی باقاعدہ تصور نہیں تھا۔ کائنات انسان کے لیے ایک پوجا کی شے تھی نہ کہ تفتیش اور تحقیق کا موضوع۔ اسلام کا یہی عظیم کارنامہ تھا جس نے زمین پر بنی نوع انسان کی تاریخ مکمل طور پر بدل دی۔ اس سیاق وسباق میں انسائیکلوپیڈیا بریٹنیکا (تاریخ ندارد) کا ایک اقتباس یہ ہے: مذاہب میں ایک وسیع پیمانے پر پھیلایا ہوا ایک سلسلہ اشیائے فطرت ہے جو قوتوں کے ساتھ خدائی صفات منسوب کرتا (دیوی دیوتا بناتا) ہے۔ اس مظہر کی وضاحت کے لیے ان اشیا کی درجہ بندی کی گئی ہے وہ یہ کہ ان میں سے کچھ آسمانی (celestial) کچھ فضائی (atmospheric) اور کچھ ارضی (earthly) ہیں۔ اس درجہ بندی کو انڈو آرین مذہب نے خود تسلیم کیا ہے: 'سُریا' (سن گاڈ) آسمانی ہے۔ 'اندرا' (آندھی، بارش اور جنگ وجدل کی دیوی) فضائی ہے۔ 'اگنی' (آگ کا دیوتا) زیادہ تر زمینی سطح پر کام کرتا ہے[1]۔

اسلام نے دنیا کو سائنسی طریق کار دیا۔ اسلام سے پہلے لوگ قدیم روایتی علم کو کسی تجربے کی بنیاد پر پرکھے بغیر قبول کرلیا کرتے تھے۔ ممتاز برطانوی مفکر اور فلاسفر برٹرینڈ رسل[2] کا کہنا تھا کہ یونانی لوگ تجربے اور مشاہدے کے مخالف تھے۔ وہ اپنی کتاب 'The Impact of Sciences on Society' میں لکھتا ہے: جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ واقعات کو مشاہدے کی بنا پر پرکھتے ہیں۔ قدیم اہل دانش سے مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن یہ بالکل ایک جدید تصور ہے جو سترہویں صدی سے پہلے بمشکل ہی پایا جاتا تھا۔ ارسطو کا موقف تھا کہ عورتوں کے دانت مردوں کے دانتوں سے کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کی

[1] Encyclopedia Britannica, Vol. 14, p. 785

[2] Bertrand Russell: برٹرینڈ رسل (1872ء - 1970ء) ایک معروف محقق، مورخ، سائنسدان، ماہر ریاضیات، ماہر طبعیات، مدرس اور فلسفی تھے۔

دوبار شادی ہوئی تھی لیکن اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ وہ اپنی بیویوں کے دانت خود گن لیتا[۱]۔

ماہر معاشرتی بشریات (social anthropologist) رابرٹ بریفالٹ[۲] یہ اعلان کرنے کی حد تک چلا گیا ہے کہ جدید سائنس مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ سائنسی تحقیق یونانیوں سے شروع ہوئی لیکن یہ مسلمان عرب ہی تھے جنھوں نے سائنسی طریق، یعنی 'تجربے کے عمل' کا طریقہ مشاہدے کا عمل اور ناپنے کا طریقہ دریافت کیا۔ اس طرح یورپ میں جدید سائنس کی بنیاد استوار ہوگئی۔ رابرٹ بریفالٹ کے مطابق: ہماری سائنس کا قرضہ جو عربوں کا قرضہ ہے وہ چونکا دینے والے انقلابی نظریات کی دریافتوں پر مشتمل نہیں ہے؛ سائنس نے اس سے کہیں زیادہ قرضہ عرب ثقافت کو ادا کرنا ہے، بلکہ اس کا وجود ہی عرب ثقافت کا مرہونِ منت ہے۔ قدیم دنیا جیسا کہ ہم جانتے ہیں سائنس سے پہلے کی دنیا تھی۔ یونانیوں کے علومِ فلکیات اور ریاضی جو غیر ملکی درآمد کاری تھے، یونانی ثقافت کے اندر کبھی کماحقہٗ رچ بس نہ سکے۔ ٹھیک ہے کہ یونانیوں نے انہیں ترتیب دی، ان کو عمومی بنایا اور ان کی نظریہ سازی بھی کی۔ لیکن صبر و تحمل کے طور طریقوں پر مشتمل تفتیش، مثبت علم کی جمع بندی، سائنس کے باریک بینی کے طریقے، تفصیل طلب اور طویل مدتی مشاہدات اور تجرباتی تحقیق وغیرہ یونانی مزاج کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ صرف قدیم کلاسیکی دنیا (چہارم تا یکم صدی قبل مسیح) کے سکندریہ میں کچھ سائنسی کام ہوسکا تھا لیکن جس علم کو ہم سائنس سے تعبیر کرتے ہیں وہ یورپ میں ایک نئے جذبۂ تفتیش، طریق ہائے تحقیق، تجربات و مشاہدات، پیمائش اور ریاضی کی ترقی کے ذریعے آئی۔ جن سے اہل یونان بے خبر تھے۔ پوری دنیا کو اس جذبۂ تفتیش و تحقیق اور طریق ہائے کار سے عربوں نے متعارف کرایا تھا[۳]۔

قرآن مجید کائنات میں پیدا کردہ تمام اشیا پر غور و فکر کرنے پر بہت زور دیتا ہے۔ یہی اشیا ہیں

[۱] The Impact of Sciences on Society, p.17

[۲] رابرٹ بریفالٹ (1874ء-1948ء) ایک فرانسیسی ماہر سرجن تھا۔ جس نے بطور ماہر معاشرتی بشریات اور ایک ناول نگار کے شہرت حاصل کی۔

[۳] Making of Humanity, p. 190.

جنہیں ہم آج سائنس کہتے ہیں۔ یہ باضابطہ اور منضبط طریق کار ہمیں خدا پاک کے قریب لے جاتا ہے۔ تاریخ اسلام اس حقیقت کی گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اولین دور میں سائنسی علوم میں بے پناہ ترقی کی تھی۔ برٹرینڈ رسل اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مسلمانوں نے سائنسی علوم اور تعلیم کو بہت فروغ دیا اور انہوں نے سائنس میں دنیا کی اس وقت رہنمائی کی جب یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت ہندوستان سے سپین تک ایک شاندار اسلامی تہذیب اپنی ترقی کی منازل طے کررہی تھی۔ وہ کہتا ہے: ہم 'تاریک دور' کے الفاظ، 600ء سے 1000ء تک کے زمانے پر پردہ ڈالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں چونکہ مغربی یورپ پر ہمارا غیر ضروری ارتکاز تھا۔ چین کے اس زمانے میں ٹینگ خاندان (Tang Dynasty) کا دور، چینی شاعری کے عروج کا دور اور کئی پہلوؤں سے بہت ہی قابل ذکر عہد شامل تھا۔ ہندوستان سے سپین تک اسلام کی شاندار تہذیب فروغ پارہی تھی۔ عیسائیت کو اس وقت جو شکست ہوئی وہ تہذیب کو شکست نہیں ہوئی تھی بلکہ معاملہ بالکل برعکس تھا[1]۔

(2) طبی علوم

عہد متوسط کے دوران طبی شعبے میں مسلمان علما نے زبردست خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کی نوعیت بہت غیر معمولی تھی۔ الرازی[2] بلاشبہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا طبیب تھا اور دائمی شہرت پانے والے اطباء میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی تصانیف کے لاطینی زبان میں وسیع پیمانے پر تراجم ہوئے۔ یہ تراجم 'Rhaze' کے نام سے ہوئے اور اسلامی دنیا سے باہر بھی ان کے اثرات مرتب ہوئے۔ الرازی کی تصنیف کتاب المنصوری، دس (10) جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ یونانی دواؤں پر لکھی گئی ہے۔ لاطینی زبان میں یہ 'Liber ad Almanisorem' کے عنوان سے چھپی۔ اس کی ایک اور غیر معمولی تصنیف 'الجدری والحسبہ' چیچک اور خسرہ کے امراض کے بارے میں ہے

[1] The History of Western Philosophy, p.372

[2] ابوبکر محمد بن زکریا رازی (854ء-925ء) مسلمان سائنسدان، ماہرِ طبیعیات، ہیئت دان اور فلسفی تھے۔

اوراس موضوع پر انتہائی مستند کتاب ہے جو آج بھی زبردست افادیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ اس کا لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور یہ 1498ء اور 1866ء کے درمیان چالیس (40) سے زائد مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کی ایک جامع اور معروف کتاب 'الحاوی' بیس (20) جلدوں پر مشتمل ہے۔ شاہِ سسلی (King of Sicily,Charles I) کے حکم پر سسلی کے یہودی طبیب فراج بن سالم[۱] نے اس کا 'Continens' کے عنوان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ الرازی نے امراضِ نسواں (gynecology) اور زچہ بچہ (obstetrics)، امراضِ چشم (ophthalmology) اور امراضِ گردہ (nephrology) پر بھی کتابیں لکھیں۔ وہ ایک نامور سرجن بھی تھا اور اس نے سرجری میں سیٹن[۲] کا طریقہ کار بھی متعارف کروایا۔

الرازی نے ایک مخصوص 'ڈوری' (sutures) بنائی جو اس نے مویشیوں سے حاصل کی تاکہ ریشوں (tissues) کو جوڑا جا سکے۔ وہ پہلا معالج تھا جس نے زخموں کے علاج کے لیے ڈوری استعمال کی۔ اس نے علم کیمیا کے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے چند مرکبات بھی تیار کئے مثلاً مرکری سالٹس، لیڈ اور کاپر سالٹس جو پہلی دفعہ علاج میں استعمال ہوئے۔ اس کی عملی کامیابیوں کا بہت سا حصہ ان مرکبات کو آزمائشی طور پر بندروں پر استعمال کرنے پر مشتمل تھا۔ وہ اس معاملے میں بھی پہلا معالج تھا کہ اس نے مرہموں میں سفید لیڈ استعمال کیا اور پارا کو بطور جلاب استعمال کیا۔ اس کے علم اور تجسس نے طب کے شعبے میں اسے سب سے بلند مقام دلوا دیا جب کہ دیگر معاشرے اس کی پیش رفتوں کے ساتھ قدم ملانے کے لیے اس کے تراجم میں سر کھپاتے رہ گئے۔

---

[۱] فرج بن سالم (تیرہویں صدی عیسوی) سسلی کا یہودی طبیب اور مترجم تھا۔ سسلی کے بادشاہ چارلس اول نے اسے عربی زبان کی طب کی کتب کو لاطینی میں ترجمہ کرنے کے ذمہ داری سونپ دی تھی۔ فرج نے بڑی ہی کامیابی سے عربی زبان کی طب کی کتب خاص طور پر رازی کی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

[۲] 'Seton Stitch' سرجری کا طریقہ کار ہے۔ اس طریقہ کار میں زخم میں سے ایک سرجیکل ڈوری گزار دی جاتی ہے تاکہ یہ ڈوری ایک راستہ بنائے جو زخم میں سے باہر چلا جائے۔ اس راستہ کے ذریعے پیپ اور دوسرا مواد زخم سے باہر نکلتا رہتا ہے اور زخم مندمل ہوتا رہتا ہے۔

علی ابن العباس المجوسی[1] جسے مغرب میں 'ہالی عباس' (Haly Abbas) کہا جاتا تھا ایک معتبر عالم تھا۔ اس نے 'کتاب الملکی' تصنیف کی، جس کا لاطینی نام 'Liber Regius' تھا۔ یہ ایک مبسوط انسائیکلوپیڈیا تھی جس میں میں طب کے نظریات (theory of medical science) اور عمل پر لکھا گیا تھا۔ یہ اس وقت تک معیاری کتاب رہی جب تک ابن سینا کی شاہکار تصنیف 'Canon' نے اس پر سبقت حاصل نہیں کر لی تھی۔ المجوسی پہلا معالج تھا جس نے نظامِ رگِ شعری (Capillary System) کے بارے میں لکھا اور یہ تفصیلات بھی بیان کیں کہ بچہ کیسے جنم لیتا ہے۔

ابن سینا کا شمار مسلم دنیا کے مشہور دانشوروں میں ہوتا تھا۔ اسے ارسطو کے بعد ذہین ترین شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس کی عظیم الشان کتاب 'القانون فی الطب' ہے[2]۔ لاطینی زبان میں اس کا نام 'Canon of Medicine' ہے۔ یہ عربوں کی نظم بندیٔ علم کی مہارت تامہ کی مظہر ہے۔ یہ میڈیکل انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں سات سو ساٹھ (760) دواؤں اور امراض پر تحقیق شامل ہے۔ اس میں پورے جسم کے امراض بشمول پانی کے ذریعے پھیلنے والی بیماریوں کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر 'پیتھالوجی'[3] اور 'فارماکوپیا'[4] سے متعلق ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں گیراڈ آف کریمونا[5] نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے یورپ کے اہل علم کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں یہ یورپ کی مختلف زبانوں میں سینکڑوں بار شائع ہوئی۔

---

[1] Ali ibn al-Abbas al-Majusi: علی بن العباس المجوسی (دسویں صدی عیسوی) ایک ماہر طبیب تھے۔ طب میں ان کی مشہور زمانہ کتاب کامل الصناعہ الطبیہ الضروریہ، یہ کتاب، الکتاب الملکی (شاہی کتاب) کے نام سے مشہور ہے۔

[2] قوانین ادویات

[3] طب کے ذیلی موضوع Pathology میں امراض کی فطرت، کسی بھی متعلقہ بیماری کی ساخت، اس بیماری کا جسمانی اعضاء، نسیج اور خلیات پر اثر اور اس بیماری کی وجہ سے پیدا (یا ناپید) ہونے والے مظاہر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

[4] ادویات بنانے کے علم کو دستور الادویہ (pharmacopia) کہتے ہیں۔

[5] Gerard of Cremona: گیراڈ آف کریمونا (1114ء-1187ء) ایک اطالوی مترجم تھا، جس نے بے شمار سائنسی کتب کا عربی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

القانون پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپی یورنیورسٹیوں کے کل طبی نصاب کا نصف حصہ تھا اورتقریباً 1650ء تک مغرب کی یونیورسٹیوں میں نصابی کتاب کے طور پڑھائی جاتی رہی ہے[1]۔

زہراوی ایک نامور جراح (surgen) تھا جس نے التصریف لکھی۔اس کتاب میں تمام آلات جراحی کی اشکال اورطریقہ ہائے جراحت پرروشنی ڈالی گئی ہے۔اس کتاب نے مشرق اورمغرب کےفن جراحی کے ارتقاء میں قابل قدراضافے کیے ہیں۔الزہراوی پہلاسرجن تھا جس نے خون کی نالیوں کےسرجیکل آپریشنز (جراحت) کیے۔مثلاً اس نے کٹی ہوئی شریانوں کی سلائی کی اور انہیں اس حال میں جوڑا، جب ان میں خون جاری تھا۔اس نے پہلی بار زخموں کو جوڑنے کے لیے ریشمی دھاگا استعمال کیااوردانتوں کےعلاج کے لیےسونے کے رباطی بندھن (ligaments) استعمال کیے۔اس نے پلاسٹک کی سلائی اور متعدد دیگر آلات جراحی کوترقی دی جس سے حکماء (طبیب) پہلے آگاہ نہ تھے۔اس نے ان آلات کی تصاویر بنوائیں۔ان کے سائز اور انہیں بنانے کے لیےاستعمال ہونے والےسامان (material) کی تفصیلات بتائیں۔

زہراوی نے مثانے کی پتھری نکالنے کے لیےعمل جراحی اورحلق کےغدودنکالنے کےفن کوترقی دی۔علاوہ ازیں اس نے بوقت پیدائش 'جنین' (embryo) کی پوزیشن معمول کےمطابق نہ ہونے کی بنا پر بچے کو تسلے (basin) میں جنوانے (deliver) کا طریقہ وضع کیا۔اس نے خواتین کا آپریشن کرنے کے وقت خواتین نرسوں کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت پرزوردیا کیونکہ خواتین نرم دل ہوتی ہیں اورمریض ان کے ساتھ زیادہ انس محسوس کرتی ہیں۔ابن سینا کی 'القانون' اورزہراوی کی علم جراحت (سرجری) پرتصنیف 'التصریف' سترہویں صدی عیسوی تک پورے یورپ میں نصابی کتب کےطور پر پڑھائی جاتی رہیں۔

الزہراوی کی سرجری سے متعلق کتاب التصریف کا گیراڈ آف کریمونا نے عربی سے لاطینی میں

---

[1] The Arabs, p. 110.

ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف ایڈیشن چھپے۔ وینس میں 1497ء میں باسل میں 1541ء میں اور آکسفورڈ میں 1778ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ کئی صدیوں تک یورپ کے میڈیکل سکولوں میں بطور نصاب پڑھایا جاتا رہا[1]۔

بغداد کے علی بن عیسیٰ الکحال[2] (لاطینی نام Jesu Occulist) نے امراض چشم پر ایک شاندار کتاب لکھی۔ اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب یورپ میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک امراض چشم کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی رہی۔ حنین بن اسحاق[3] نے امراض چشم پر دس مضامین لکھے۔ اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی جس میں امراض چشم پر تمام مطلوبہ معلومات یکجا کر دی گئی تھیں۔

ابوالہیثم جو مغرب میں 'Alhazen' کے نام سے معروف تھا۔ اسے بصریات (optics) میں سند مانا جاتا تھا۔ دنیا نے اس جیسا ماہر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اس موضوع پر 'اقلیدس'[4] اور بطلیموس[5] کے نظریات کی تصحیح کی۔ اس کی تصنیف 'Opticae Thesaurus' نے علم

---

[1] The Arabs, p.577.

[2] Ali ibn Isa al-Kahhal: علی بن عیسیٰ الکحال (گیارہویں صدی عیسوی) مشہور ماہر امراض چشم تھا۔

[3] Hunayn Ibn Is-haaq: حنین بن اسحاق (809ء–873ء) ایک فلاسفر، سائنسدان، طبیب اور مترجم تھا۔

[4] Euclid: اقلیدس ایک یونانی ریاضی دان تھا جو مصری شہر اسکندریہ میں تیسری صدی قبل مسیح میں رہا۔ اس کی کتاب ایلیمنٹس (Elements) ریاضی کی تاریخ کی مشہور ترین اور سب سے زیادہ دیر تک پڑھائی جانے والی نصابی کتاب ہے۔

[5] Ptolemy: بطلیموس (100ء–170ء) ایک مشہور یونانی ماہر فلکیات، جغرافیہ دان اور ریاضی دان تھا۔

بصریات پر لکھنے والے 'راجر بیکن'[1]، لیونارڈ ڈاونچی[2]، جان کیپلر[3] اور عہد متوسط کے کئی اور مغربی مصنفین کو متاثر کیا۔ ابوالہیثم نے بصارت کے قدیم نظریہ کو بدل دیا کہ شعاع ہماری آنکھ سے نکل کر کسی چیز سے ٹکراتی ہے تو ہم اس چیز کو دیکھتے ہیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ روشنی اس چیز سے ٹکرا کر ہماری آنکھ تک پہنچتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں۔

ابن رشد نے طب پر سولہ (16) معتبر کتابیں لکھیں جن میں ایک 'کلیات فی الطب' ہے۔ یہ دواؤں کے عمومی اصولوں سے متعلق ہے۔ لاطینی میں اس کا ترجمہ 'Colliget' کے عنوان سے چھپا ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت، معیار اور افادیت کی بنا پر یورپ میں کئی بار شائع ہوئی۔

ابن کتینہ ایک بربری حکیم تھا۔ اس نے طاعون (plague) پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی اور وہ اس سے پہلے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں پر فوقیت حاصل کر گئی۔ اس کی پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں تدوین اور ترجمہ ہوا۔ اس کتاب میں طاعون (plague) کے متعدی مرض ہونے کا انکشاف کیا گیا اور علاج بھی بتایا گیا۔ اس سے قبل یونانی اطباء اس سے آگاہ نہیں تھے۔

ابن نفیس[4] قاہرہ میں منصوری ہسپتال کا منتظم تھا جو اس وقت دنیا کا بہترین ہسپتال تھا۔ ابن نفیس نے 'نظام دوران خون' (minor circulatory system) دریافت کیا۔ دائیں طرف کے

---

[1] Roger Bacon: راجر بیکن (1214ء-1294ء) ایک انگریز فلسفی اور راہب تھا۔ یہ ایک عرصہ تک پیرس میں ارسطو کے فلسفے پر لیکچر دیتا رہا۔ اسے 1277ء میں کیتھولک کلیسا نے مجرم قرار دیا اور قید میں ڈال دیا وہیں وفات پائی۔

[2] Leonardo da Vinci: لیونارڈو ڈاونچی (1452ء- 1519ء) ایک اطالوی عالم، سائنسدان، حساب دان، موجد، تشریح دان، مصور، مجسمہ ساز، معمار، ماہر نباتیات، موسیقار اور مصنف تھا۔ انہیں نشاۃ ثانیہ کے مرکزی کردار سمجھا جاتا ہے۔

[3] Johannes Kepler: جان کیپلر (1571ء-1630ء) ایک جرمن ماہر فلکیات، ریاضی دان اور سترھویں صدی عیسوی کے سائنسی انقلاب کی ایک بہت اہم شخصیت تھا۔ وہ سیاروں کی حرکت کے قوانین دریافت کرنے کے لیے مشہور تھا۔

[4] ابوالحسن علاء الدین علی بن ابی الحرم المعروف ابن نفیس (1213ء-1288ء) مشہور مسلمان طبیب اور فلسفی تھے۔

دورانِ خون (پھیپھڑوں کے حوالہ سے) سے متعلق ابن نفیس کی تصانیف ولیم ہاروے[1] کی کتاب'De Motu Cordis' (1628ء) سے پہلے کی ہیں۔ دونوں نظریات دورانِ خون کی وضاحت سے متعلق ہیں۔ دونوں مل کر گردشِ خون پر روشنی ڈالتی ہیں اور یہ قلبی افعال کی اولین اور بہترین مشرقی اور مغربی تحقیقات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ابن نفیس کی معروف ترین طبی تحریروں میں سے ایک کتاب 'جامع' کے عنوان سے تھی جو دس (10) جلدوں پر مشتمل تھی۔

ابن مساویہ[2] نے دنیا میں سب سے پہلے آنکھوں کی امراض (ophthalmology) کی کتاب عشر مقالات فی العین (آنکھ پر دس مضامین) لکھی[3]۔

(3) علم کیمیاء

علم کیمیا (Chemistry) کو بطور سائنس بلا شک وشبہ مسلمانوں نے متعارف کروایا۔ سائنس کے اس شعبہ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ خدمات سرانجام دیں اور اسے کاملیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچایا۔ مسلمانوں کو ان کی دریافتوں اور ان کے فہم کیمیاء کی وجہ سے سترہویں صدی تک سند سمجھا جاتا رہا ہے۔ جابر بن حیان[4] اور الرازی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انہیں عہدِ متوسط کے سب سے بڑے کیمیادان کہا جاتا تھا۔

جابر بن حیان کو جدید کیمیاء کا باپ کہا جاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام مادوں (matters) کی

---

[1] William Harvey: ولیم ہاروے (1578ء-1657ء) ایک انگریز سائنسدان تھا جس نے خون کی گردش اور دل کے افعال پر کام کیا۔

[2] Ibn Masawayh: یوحنا بن مساویہ (777ء-857ء) ایک نسطوری عیسائی طبیب اور بغداد کے ایک ہسپتال کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے متعدد موضوعات بشمول امراض چشم، بخار، دردِ سر، مالیخولیا، غذائیات اور طبی اقوال سے متعلق علمی مقالے لکھے۔

[3] The Arabs, p.364

[4] Geber: ابوموسیٰ جابر بن حیان (721ء-806ء) تاریخ کا سب سے پہلا کیمیادان اور عظیم مسلمان سائنسدان تھا۔ جس نے سائنسی نظریات کو دینی عقائد کی طرح اپنایا۔ دنیا آج تک اسے بابائے کیمیا کے نام سے جانتی ہے۔

ابتداء کا سراغ لگایا جائے تو وہ ایک سادہ سا ذرہ ہوگا جو چمک اور آگ پر مشتمل ہوگا اور مادے کی ناقابل تقسیم اکائی (unit) ہوگی۔

اس نے انیس (19) عناصر دریافت کیے اور وزن مخصوص (measurements of specific weights) کی صحیح پیمائشیں کیں۔ متعدد کیمیائی تعامل (chemical processes) مثلاً عمل کشید (distillatiion) مائع کو قلموں کی شکل میں جمانا (crystallization) اور عمل تصعید (sublimation) کے تجربات کیے۔ وہ اس لحاظ سے بھی پہلا شخص تھا جس نے سرکہ (vinegar) کو عمل کشید کے ذریعے 'Acetic acid' میں تبدیل کیا۔ مادے کی محلول حالت سے اس کی اضافی حل پذیری یا عدم حل پذیری متعارف کروائی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے گلاس ٹیوبز اور بوتلیں بڑے پیمانے پر استعمال کیں اور اس نے اپنی تحقیق میں جانچ پڑتال کی اہمیت پر زور دیا تھا۔

اس نے کیمیا کے دو نہایت اہم تعاملات 'تکلیس'[1] (calcination) اور 'تقلیل'[2] (reduction) کی سائنسی طور پر وضاحت کی۔ اس نے عمل ہائے 'تبخیر' (evaporation)، 'تصعید' (sublimation)، 'تقطیر' (filtration)، 'کشید' (distillation) اور 'قلماؤ' (crystallization) کو نمایاں طور پر ترقی دی۔ سائنسی مؤرخ ہولمیارڈ[3] اپنی کتاب 'Makers of Chemistry' میں کہتا ہے کہ جابر بن حیان کیمیائی تعامل کے دوران رونما ہونے والے

---

[1] calcination: عمل تکلیس ایک کیمیائی عمل ہے جس میں ہوا یا آکسیجن میں بہت زیادہ درجے کی حرارت پہنچائی جاتی ہے جو 550-1150 ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتی ہے۔ اسے انتہائی ٹھوس مواد کی thermal decomposition کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

[2] reduction: تقلیل، اس کیمیائی تعامل میں کسی چیز کے ایٹم میں سے آکسیجن کو ہٹا دیا جاتا ہے یا پھر ہائیڈروجن کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

[3] Eric John Holmyard: ارک جون ہولمیارڈ (1891ء-1959ء) ایک ماہر تاریخ دان برائے سائنس و فنون تھا۔ وہ ایک عرصہ تک مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی سرگرمیاں بھی سرانجام دیتا رہا۔

تغیرات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ وضاحت کرتا ہے کہ دھاتوں کو کس طرح 'تکلیس' کے ذریعے آلائشوں سے پاک کیا جا سکتا ہے اور کن کن طریقوں سے دھاتوں کی تکلیس کی جا سکتی ہے[۱]۔

جابر بن حیان نے کیمیائی مادے بشمول شنگرف 'cinnabar' (پارے کا سلفائیڈ) اور سنکھیا (arsenic oxide) تیار کرنے کے طریقے کی تفصیل بتائی۔ اس نے مرکری آکسائیڈ (mercury oxide) بنایا اور وہ خام سلفیورک ایسڈ (crude sulfuric acid) اور نائیٹرک ایسڈ (nitric acid) بنانے کے طریقوں سے خوب آگاہ تھا۔ ایسے کیمیائی مادوں پر اس کے مقالے کئی یورپی زبانوں بشمول لاطینی میں چھپے۔ جدید کیمیا نے جابر بن حیان کی وضع کردہ کئی سائنسی وفنی اصطلاحات کو اختیار کیا ہے۔ اس نے دھاتوں کی ارضیاتی تشکیل (geologic formation of metals) کا نظریہ بھی پیش کیا اور کیمیا کے بہت سے عملی اطلاقات بتائے۔ مثلاً دھاتوں کو مصفیٰ (refinement) کرنا، فولاد بنانا، کپڑے اور چمڑے کو رنگنا، کپڑوں کی وارنشنگ کر کے انہیں واٹر پروف بنانا اور مینگنیز ڈائی آکسائیڈ (manganese dioxide) کو شیشے رنگنے کے لیے استعمال کرنا۔ علاوہ ازیں اس نے مسودوں کے لیے سستی اور چمکیلی روشنائی (ink) تیار کرنے اور شیشہ سازی کے لیے مینگنیز ڈائی آکسائیڈ (manganese dioxide) کے استعمال کرنے کے طریقوں کا ذکر بھی کیا ہے[۲]۔

جابر بن حیان نے ایک نہایت نفیس وحساس (precise) ترازو بنایا جو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی صحیح وزن کر سکتا تھا۔ اس نے کیمیائی امتزاجوں (combinations) کو عناصر کے باہمی ارتباط سے تعبیر کیا اور انہیں ایسے اجزا (particles) قرار دیا جو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ 'محدب شیشے' کے بغیر نہیں دیکھے جا سکتے اور اتنے مہین ہونے کے باوجود اپنی خصوصیات برقرار رکھتے ہیں۔ اس

---

۱ Makers of Chemistry, p. 59

۲ ibid

نے یہ تصریحات جان ڈالٹن[۱] سے دس صدیاں پہلے کی تھیں۔ اس نے نئی پیداواروں (products) کا تعین کیا۔ جن میں الکلیاں (alkalines)، تیزاب (acids)، نمکیات (salts)، روغنیات (paints) اور چکنائیاں (greases) شامل تھیں۔ اس نے گندھک کا تیزاب (Sulfuric acid)، نمک کا تیزاب (nitro-hydrochloric acid) بنائے (جنہیں وہ بعض دھاتوں کو حل کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا)۔ اسی طرح اس نے کاسٹک سوڈا (caustic soda) اور متعدد سالٹس (salts) تیار کیے۔ مثلاً سلفیٹس (sulphates)، نائیٹریٹس (nitrates)، پوٹاشیم (potassium) اور سوڈیم کاربونیٹس (sodium carbonates)۔ دھاتوں اور نمکیات پر اس کی تحقیق کی بنا پر بعدازاں ڈھلائی کی طریقے (foundry techniques) اور ٹائلوں اور ظروف کو چمکانے کے نسخے تیار کرنے میں مدد ملی[۲]۔ جابر بن حیان کی وفات کے تقریباً ایک صدی بعد الرازی نے علم کیمیا کی بنیادیں استوار کیں۔ جن سے جدید دور میں بڑی مدد ملی۔ الرازی نے اپنی کتاب 'رازوں کا راز' (Secret of Secrets) میں اشیائے فطرت کی ایک نہایت مفید 'درجہ بندی' (classification) پیش کی۔ اس نے مادوں کو زمینی، نباتاتی اور حیوانی مادوں میں تقسیم کیا اور ان میں کچھ مصنوعی طور پر حاصل کردہ مادوں کو بھی شامل کیا۔ مثلاً لیڈ آکسائیڈ (lead oxide)، کاسٹک سوڈا (caustic soda) اور مختلف مخلوط دھاتیں (alloys)۔ آگے چل کر اس نے اپنے تجربات کی فہرست سازی اور توضیحات کیں۔ پہلے اس نے اپنے استعمال میں لائے گئے مواد (materials) کی وضاحت کی، پھر اوزار/ سازوسامان (apparatus)، طریق کار اور تجربوں کے حالات پر روشنی ڈالی۔ الرازی نے (جدید مفہوم کی حامل) لیبارٹری قائم کی، ڈیزائننگ کی اور تفصیلات اکٹھی کیں اور

---

[۱] John Dalton: جان ڈالٹن (1766ء-1844ء) ایک برطانوی ماہر کیمیا، ماہر طبیعیات اور ماہر موسمیات تھا جو جدید ایٹمی نظریہ کے لیے ابتدائی کام کرنے کی وجہ سے معروف ہوا۔

[۲] Introduction to Islamic Civilisation, p. 113

بیس سے زیادہ آلات استعمال کیے[1]۔

مسلمہ المجریطی[2] میڈرڈ (Madrid) میں رہنے والا ایک اندلسی تھا۔ اس کو اپنی ایک تصنیف 'رتبۃ الحکیم' (دانشوروں کے مراتب) کی وجہ سے شہرت ملی جس میں اس نے اور باتوں کے علاوہ قیمتی دھاتوں کے فارمولے اور ان دھاتوں کی تطہیر (purification) کے لیے بھی ہدایات دیں۔ المجریطی وہ پہلا شخص بھی تھا جس نے تحفظ مادہ (mass conservation) کے تصور کا ذکر کیا۔ یہ لیوائزیر[3] سے آٹھ صدیاں پہلے کی ایک اہم دریافت تھی۔

(4) علم الادویات

مسلم دنیا میں علم کیمیاء کی ترقی نے فن علم الادویہ (Pharmacology) کو بھی فروغ دیا۔ الرازی نے اپنی تحریروں میں علم الادویات کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا اور کیمیائی مرکبات کو علاج معالجے کے لیے استعمال کیا۔ اس کے پیشرو سابور بن سہل[4] نے علم الادویات پر لکھنا شروع کر دیا تھا جس میں اس نے مختلف بیماریوں کے علاج اور دواؤں کی بہت سی اقسام پر روشنی ڈالی۔

---

[1] Science and Technology in Islam, p. 79

[2] Maslama al-Majriti: مسلمہ المجریطی (950ء-1007ء) کا نام ابوالقاسم مسلمہ بن احمد ہے۔ المجریطی ماہر ریاضی دان تھے اور اندلس میں ریاضی دانوں کے امام کہلاتے تھے۔ علم فلکیات، کیمیا اور دیگر علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ کیمیا میں ان کی کتب رتبۃ الحکم اور غایۃ الحکیم بہت مشہور رہیں۔

[3] Antoine-Lauret de Lavoisier: لیوائزیر (1743ء-1790ء) ایک فرانسیسی کیمیا دان تھا۔ اسے اٹھارہویں صدی عیسوی کے کیمیائی انقلاب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ تاریخ کیمیا اور تاریخ حیاتیات پر بھی اس کے گہرے اثرات تھے۔ عوامی لٹریچر میں اسے بابائے جدید کیمیا قرار دیا گیا ہے۔

[4] Sabur Ibn Sahl: سابور بن سہل (نویں صدی عیسوی) ایک ماہر علم الدویات تھا۔

تقریباً ایک صدی کے بعد البیرونی[۱] نے علم الادویہ پر نہایت بیش قیمت کتاب 'کتاب الصیدانہ' لکھی جس میں دواؤں کے خواص کی مکمل معلومات تھیں۔ اس میں علم الادویات کے کردار اور دوا ساز کے کردار اور فرائض کا بھی ذکر تھا۔ ابن سینا نے تقریباً سات سو (700) معجونیں اور دیگر مرکبات تیار کیے اور ان کی تیاری کے طریقے اور ان کے خواص اور فوائد و اثرات بتائے۔ دواؤں کے بارے میں بغداد کے ابن مساویہ اور سپین کے ابن الوافد[۲] کی تصانیف لاطینی زبان میں پچاس سے زائد بار شائع ہوئیں۔ ان کے لاطینی میں نام یہ تھے:

De Medicinis Universalibus by Mesue the, Younger

Medicamentis Simplicibus by Abenguefit[۳].

زہراوی نے عمل تصعید (sublimation) اور عمل کشید (distillation) کے ذریعے دواسازی میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ اس کی کتاب 'Liber Servitoris' یہ بتاتی ہے کہ سادہ اور پیچیدہ دوائیں کیسے بنائی جا سکتی ہیں۔ الزہراوی نے مردہ سنگ[۴] (Litharge)، سفید سیسہ (white lead) کشتہ سیسہ (lead sulphide)، کشتہ تانبا (burnt copper)، کیڈمیا[۵] (cadmia)، مارکاسائیڈ (marcaside)، زرد سنکھیا (yellow arsenic)، چونا (lime) اور مختلف قسم کی پھٹکڑیاں (various vitriols)، نمکیات (salts) خام شورہ (natron) اور دیگر مادے

---

[۱] Abu Rayḥan Muhammad ibn Aḥmad Al-Biruni: ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (973ء-1084ء) ایک نامور مسلمان محقق اور سائنس دان تھے۔ البیرونی نے ریاضی، علم ہیئت، تاریخ اور جغرافیہ میں ایسی عمدہ کتابیں لکھیں جو اب تک پڑھی جاتی ہیں۔

[۲] Ibn al-Wafid: ابن الوافد (997ء-1074ء) ایک ماہر طبیب اور علم الدویات تھا۔ اس کا تعلق ہسپانیہ کے شہر طلیطلہ (Toledo) سے تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تحقیقی کتاب کا نام کتاب الدویۃ المفردہ ہے۔

[۳] Science and Medicine in the Legacy of Islam

[۴] Litharge لیڈ آکسائیڈ (PbO) کی قدرتی معدنی شکلوں میں سے ایک ہے۔

[۵] کیڈمیا، زنک (جست) کا ایک آکسائیڈ ہے جو ان بھٹیوں کے اطراف میں جمع ہو جاتا ہے جن میں تانبا یا پیتل پگھلایا گیا ہو اور زنک بخارات میں بدل جاتی ہے۔

تیار کرنے کی تراکیب بتائیں۔ اس نے مقطر اور کشید کردہ مصنوعات (علاوہ ازیں شراب) بھی تیار کیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں عمل کشید، بطور ذریعہ دوا سازی شروع ہو چکا تھا[۱]۔

ابوالمنصور المؤفق[۲] نے 'Foundations of the True Properties of Remedies' لکھی جس میں اس نے 'آرسینس آکسائیڈ' (arsenious oxide) اور 'سیلیسک ایسڈ' (silicic acid) پر روشنی ڈالی اور سوڈیم کاربونیٹ (sodium carbonate) اور پوٹاشیئم کاربونیٹ (potassium carbonate) میں امتیاز کیا۔ تانبہ کے مرکبات (copper compounds) کے زہریلے اثرات بالخصوص کا پر وٹرائل (copper vitriol) کی طرف توجہ دلائی اور مرکبات پر بھی روشنی ڈالی۔ اس نے سمندر کے پانی کو پینے کے لیے میٹھے میں تبدیل کرنے کا طریقہ کشید کا بھی ذکر کیا[۳]۔

'مارٹن لیوے'[۴] کے مطابق مسلمانوں کی دوا سازی کی کتب نے نہایت احتیاط سے عملی تحقیق وتفتیش کے اصول اختیار کیے جو دوا فروشی اور علاج معالجہ کرنے والوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئے۔ لیوے اس نے دوا سازی میں مسلمانوں کی خدمات کا یوں ذکر کیا:

(i) دوا سازی کی تراکیب: جن میں بہت سی اقسام کی دوائیں، گولیاں، دافع عفونت دھونیاں، سفوف، شربتیں، روغن، مالش کا تیل اور منجن تیار کرنا شامل ہیں۔

(ii) زہریات (poisons) کی کتابیں لکھی گئیں۔

(iii) بیماریوں کی علامات پر کتابیں جن میں طبی فوائد کے حامل پودوں کی فہرستیں ہیں۔ یہ حروف تہجی کی ترتیب سے بنائی گئی ہیں تاکہ قاری دوسری زبانوں میں بھی دوائیں شناخت کر سکیں۔

(iv) جدول کے طور پر مرتب شدہ کتب جن کی وجہ سے طویل موضوعات مختصر ہو گئے اور وہ فوراً اور

---

[۱] A History of Industrial Chemistry, p. 140-141

[۲] Abu Mansur Muvaffak Harawi: ابومنصور المؤفق ہروی (دسویں صدی عیسوی) کا ایک ماہر طبیب تھا۔

[۳] Makers of Chemistry, p. 68

[۴] Martin Levey: مارٹن لیوے (1913ء-1970ء) امریکی تاریخ دان برائے کیمیا تھا۔

آسانی سے تلاش کیے جا سکتے تھے۔ جب کہ ان کے اقتباسات ویسا ہی کام دے سکتے تھے۔

(v) مفرد دواؤں (Materia Medica) کی فہرستیں جن میں علاجیات وشفائیات سے متعلق مختلف مصنفین کی آراء، دواؤں کی تیاری اور اس شعبے میں متعلقہ مواد کی تفصیلات شامل ہیں۔

(vi) دستیاب نہ ہونے والی دواؤں کی متبادل ادویہ بتا دی گئیں۔ میڈیکل سپیشلٹیز (medical specialties) پر کتابیں مہیا کر دی گئیں خواہ وہ الگ نسخے کی صورت میں ہیں یا دواؤں کی بڑے حجم کی انسائیکلو پیڈیاز کے حصے کے طور پر ہیں[1]۔

(5) ریاضی

اسلامی دنیا نے آٹھویں صدی عیسوی سے ریاضیاتی علوم (Mathematics) میں نمایاں اضافے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے یونان اور ہندوستان کی ریاضیاتی پیش قدمیوں کو ملا جُلا کر اور اس میں اپنی پیش رفتوں کو بھی شامل کر کے اس علم کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اسلام نے چونکہ انسانی شکل کی مصوری ونمائش کی ممانعت کی تھی اس لیے مسلمانوں نے عمارتوں کی تزئین و آرائش کے لیے پیچیدہ اقلیدسی اشکال (complex geometric patterns) کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ اس کے نتیجے میں ریاضی ایک ہنر (art) بن گیا۔

810ء کے آس پاس بغداد میں قائم ہونے والے بیت الحکمہ نے یونان اور ہندوستان کی ریاضی کی ضخیم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ نویں صدی میں ذہین ریاضی دان الخوارزمی بیت الحکمہ کا اولین مہتمم (Rector) تھا۔

الخوارزمی جس کا نام لاطینی زبان میں 'الگورتمی' (Algoritmi) لیا جاتا تھا، نے ریاضی کے فروغ میں زبردست کردار ادا کیا اور الجبرا اور علم مثلثات (Trignometry) میں اختراعات کی بنیاد رکھ دی۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف 'الکتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ'
(The Compendious Book on Calculation by Completion and Balancing)

[1] Early Arabic Pharmacology, p. 68-70

ریاضی کی کتاب ہے جو لگ بھگ 830ء میں لکھی گئی تھی۔ 'الجبرا' کی اصطلاح مساوات کے بنیادی طریق ہائے کار میں سے ایک سے ماخوذ ہے جو الخوارزمی نے اپنی کتاب 'الجبر' میں بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب 'سابقہ حالت پر واپس لانے کا عمل' (restoration) ہے۔ وہ اس طرح کہ مساوات کی دونوں جانب ایک عدد کا اضافہ کر دیا جاتا ہے تاکہ رقموں کو تقویت دی جائے یا منسوخ کر دیا جائے۔ اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ رابرٹ چسٹر[1] اور گیراڈ آف کریمونا نے Liber algebrae et almucabala کے نام سے کیا۔ کتاب نے کثیر رقمی مساواتوں کو سکینڈ ڈگری تک حل کرنے کا ایک جامع طریقہ پیش کر دیا۔ تقلیل کرنے اور متوازن (balancing) کرنے کے بنیادی طریقوں پر بحث کی۔ الخوارزمی نے خطی اور چوکور مساواتوں کو بھی حل کیا[2]۔

یونانی تصور ریاضی سے ہٹ کر الجبرا کا آغاز ایک انقلابی اقدام تھا جو اساسی طور پر اقلیدسی (geometrical) تھا۔ الجبرا ایک وحدانی نظریہ تھا جو عددِ ناطق (rational numbers)، عددِ غیر ناطق (irrational numbers) اور اقلیدسی مقداروں (geometrical magnitudes) کو الجبری اعداد کے طور پر لانے کا متقاضی تھا۔ اس نے ریاضی کو نہ صرف کلی طور پر نئی جہت دے دی (جو پہلی جہت سے بہت ہی وسیع تھا) بلکہ اس نے اس مضمون کو مستقبل میں ترقی دینے کے لیے ایک آلہ بھی مہیا کر دیا۔ الخوارزمی نے تقلیل (reduction) اور متوازن (balancing) کے لیے بنیادی الجبرائی طریقے متعارف کرائے اور کثیر رقمی مساوات کو سیکنڈ ڈگری تک حل کرنے کے لیے ایک جامع طریقہ مہیا کر دیا۔ اس طرح اس نے ایک طاقتور تجریدی ریاضیاتی زبان تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ زبان اب بھی پوری دنیا میں استعمال ہوتی ہے اور اس نے ریاضی کے قضیات (mathematical problems) کا تجزیہ کرنے کا بہتر طریقہ فراہم کر دیا ہے۔

الخوارزمی کی دوسری بڑی تصنیف 'کتاب الجمع والتفریق بحساب الہند' تھی جو اندازاً 825ء میں

[1] Robert of Chester: رابرٹ چسٹر بارہویں صدی کا ماہر مترجم تھا جس نے خوارزمی اور جابر بن حیان کی عربی کتب کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

[2] The Arabic Hegemony, p. 252

لکھی گئی۔ اس کتاب نے پورے مشرق وسطیٰ اور یورپ میں ہندوعربی نظامِ ہندسہ پھیلا دیا۔ اس کا لاطینی زبان میں نام 'Algorithmi de numero indorum' ہے۔ الخوارزمی کا لاطینی زبان میں نام 'الگورتھمی' تھا۔ اسی سے 'الگورتھم' کی اصطلاح وجود میں آئی۔ ریاضی کے لیے اس کا اہم ترین کردار یہ تھا کہ اس نے ہندوعربی نظامِ اعداد (9-1 اور O) کی ترویج کے لیے پرزور وکالت کی۔ جس نے ہندوستانی ریاضی کی شکل اختیار کر لی۔ اسے اس نے ایسی قوت اور صلاحیت قرار دیا جس سے ریاضی میں انقلاب آ سکتا ہے۔ اسے پوری دنیا نے اختیار کر لیا۔ اس کی کتاب 'زج سند ہند' (Zij al-Sindhind) میں بھی sines اور cosines کے مثلثاتی تفاعل کے پیمانے (tables) موجود تھے۔ اس کی طرف 'کروی مثلثات' (Spherical trignometry) کی ایک کتاب بھی منسوب ہے۔

الکرجی[1] نے الجبرا کو اس کے اقلیدسی (geometrical) ورثے سے آزاد کرا کر اور نظریۂ الجبری علم الاحصاء (Algebric calculus) متعارف کرا دیا۔ اس طرح الجبرا کی سرحدیں مزید آگے دھکیل دی گئیں۔

الکرجی اپنے حاصل کردہ نتائج ثابت کرنے کے لیے ریاضیاتی استقراء (mathematical induction) کا طریقہ استعمال کرنے والا پہلا شخص تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ اگر اعداد صحیحہ کا ایک مجموعہ پہلے عدد صحیح تک درست ہے تو اسے زیر بحث عددِ صحیح کے معاملے میں بھی درست ہونا چاہیے۔ بہ الفاظ دیگر اعداد کے دیئے گئے مجموعے کا ثبوت پہلے عدد صحیح تک درست ثابت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اگر یہ سابقہ اعدادِ صحیح کے معاملے میں درست ہے تو اسے زیر بحث عددِ صحیح کے معاملے میں بھی درست ہونا چاہیے۔ اس نے 'ثنائی مسئلے' (Binominal theorem) کو ثابت کرنے کے لیے ریاضیاتی استقرا (mathematical induction) کو استعمال کیا۔ یہ ایک فارمولا ہے جس کی مدد سے کسی بھی دو عددی جزو کے اضعاف کے بغیر کسی تفصیلی حساب کے معلوم کیے جا

[1] ابوبکر بن محمد بن الحسین الکرجی (953ء-1029ء) ایک ماہر ریاضی دان اور انجنیئر تھے۔

سکتے ہیں۔ یہ صرف جمع تفریق ضرب اور مثبت عددِ سالم کے اوپر لگی ہوئی علامت یا نشانی (جو یہ ظاہر کرے کہ اس کی کتنے درجے کی قوت ہے) سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً (Y+X)۔ عددی سروں (Co-efficients) کی اس وقت ضرورت پڑتی ہے جب ایک دو رقمے (binomial) کو پھیلا کر متشاکل مثلث بنایا جائے۔ اسے عام طور پر 'پاسکل ٹرائینگل' (Pascal's Triangle) کہا جاتا ہے۔ یہ سترہویں صدی عیسوی کے ایک ریاضی دان بلز پاسکل[1] سے منسوب ہے۔ اگر چہ دیگر ریاضی دانوں نے اس کا صدیوں پہلے مطالعہ کیا تھا جن میں الکرجی بھی شامل تھا۔

عمر خیام[2] نے بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جذر اور جذر الکعب نکالنے کے ہندوستانی طریقوں کی تعمیم (generalized) کرکے اس میں چوتھی، پانچویں اور اس سے بڑی بڑی جذریں شامل کر لیں۔ اس نے مکعبی قضیوں (cubic problems) کا باضابطہ تجزیہ کر کے انکشاف کیا کہ دراصل مساوات (equations) کی بہت سی مختلف اقسام ہیں۔ اس نے 1070ء میں ایک نہایت ذی اثر کتاب

'Treatise on Demonstration of Problems of Algebra'

لکھی جس میں الجبرا کے اصول مرتب کیے گئے تھے جو آخر کار یورپ پہنچ گئے۔ خاص طور پر اس نے مکعبی مساوات کے سوال حل کرنے کے عمومی طریقے وضع کر لیے حتیٰ کہ انہیں اعلیٰ درجوں تک پہنچا دیا۔ اس کتاب میں اس نے دو رقمی مقداروں (binomical coefficients) کی مثلثی ترتیب پر روشنی ڈالی جو آگے چل کر پاسکل کی مثلث کہلانے لگی۔ 1077ء میں خیام نے 'شرح ما اَشْکَلَ مِنْ مصادرات کتاب اقلیدس' لکھی جس کا انگلش میں ترجمہ

---

[1] Blaise Pascal: بلیز پاسکل (1623ء-1662ء) ایک فرانسیسی ریاضی دان طبیعیات دان، موجد، مصنف اور مسیحی فلسفی تھا۔ اس نے مائعات پر تحقیقات کیں اور دباؤ اور خلا کے تصورات کو واضح کیا۔ اس نے کیلکولیٹر پر بھی کام کیا۔ مکینیکل کیلکولیٹر کے پہلے دو موجدوں میں سے ایک تھا۔

[2] عمر خیام (1048ء-1131ء) علم ہیئت اور علم ریاضی کا بہت بڑا فاضل تھا۔ شعر و سخن میں بھی اس کا پایا بہت بلند ہے۔

'On the Difficulties of Euclids Definitions'

کے نام سے کیا گیا۔

طوسی[۱] علم المثلثات (Trigonometry) کو ایک الگ ریاضیاتی شاخ کے طور پر لینے والا پہلا شخص تھا جو فلکیات سے غیر مماثل ہے۔ مثلث میں حادہ زاویئے کے تفاعل (sine) پر یونانی اور ہندوستانی تحریروں کو توسیع دیتے ہوئے کروی مثلثیات (spherical Trignometry) کی اولین وسیع تشریح کی۔ جس میں کروی مثلثیات میں قائمۃ الزاویہ مثلث کے چھ واضح غیر مماثل کیسوں کی فہرست شامل تھی۔ ریاضی میں اس کی گرانقدر خدمات میں ایک خدمت یہ تھی کہ اس نے مستوی مثلثوں کے حادہ زاویوں کے تفاعلات (sines) کے مشہور قانون کی تشکیل کی:

(Sin C)/c=(Sin B/b=(Sin A)/a

اگرچہ کروی مثلثوں کے لیے 'sine law' دسویں صدی عیسوی کے ایرانی عالم ابوالوفا[۲] اور ابونصر منصور[۳] دریافت کر چکے تھے۔

ثابت ابن قرا[۴] نے ایک عام کلیہ وضع کیا جس سے اعداد متحبہ (Amicable) اخذ کیے جا سکتے تھے۔ یہ ایسے اعداد کا جوڑا ہیں جن کے لیے ایک عدد کے تقسیم کنندوں کا حاصل جمع دوسرے عدد کے مساوی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 220 کے صحیح تقسیم کنندے 1، 2، 4، 5، 10، 11، 20، 22، 44، 55 اور 110 ہیں۔ 284 کے صحیح تقسیم کنندے 1، 2، 4، 71 اور 142 ہیں جن کا

[۱] خواجہ محمد بن محمد بن حسن طوسی (1201ء۔1274ء) المعروف محقق طوسی ایک عالم، شاعر اور سائنسدان تھا۔

[۲] ابوالوفاء ایک عظیم ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا جس نے بے شمار کتابیں لکھیں اور یونانی زبان سے عربی زبان میں ریاضی کی کتب کا ترجمہ بھی کیا۔

[۳] ابونصر منصور بن علی بن عراق (970ء-1036ء) ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ ان کی کتب رسالہ فی اصلاح شکر من کتاب منلاوس فی الکریات، المجسطی الشاہی اور الدوائر التی تحد الساعات الزمانیہ ہیں۔

[۴] Thabit ibn Qurra: ثابت بن قرا (826ء- 901ء) ایک عرب ریاضی دان، ماہر طب و فلکیات اور مترجم تھا۔ فلکیات میں اسے بطلیموسی نظام کے اولین مصلحین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابن قرا مکینیات کی ایک شاخ سکونیات کا بانی تھا۔

حاصل جمع 220 ہے۔ اس کلیے کو بعد میں بہت دیر سے فرمیٹ[1] اور 'ڈیکارٹ'[2] دونوں نے ازسرنو دریافت کیا۔

ابوالہیثم نے بصریات، طبیعیات، الجبرا اور جیومیٹری کے درمیان ربط قائم کرنے پر عظیم الشان کام کرنے کے علاوہ ایک ایسا طریقہ بھی وضع کیا جسے اب 'مسئلہ ابن الہیثم' (Alhazen's problem) کہا جاتا ہے۔ آخرکار اس نے اسے 'چوتھی قوتوں' کے مجموعے کا فارمولا اخذ کرنے کی طرف رہنمائی کی۔ جبکہ اس سے پہلے صرف مربعوں اور مکعبوں کے مجموعے کے فارمولے بیان کیے گئے تھے۔ اس کے طریقے کو فوری تعمیم (generalized) کر کے اعدادِ صحیح کی قوتوں کے حاصلِ جمع کا فارمولا تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس نے انٹیگرل پاورز (integral powers) کے حاصل جمع کے اپنے نتیجے کو اس کام کے لیے استعمال کیا جسے انٹیگریشن (integration) کہا جاتا ہے۔ جس میں سالم مربعوں اور 'چوتھی قوتوں' کے حاصل جمع کے فارمولوں نے اس کے لیے 'مکافی مجسم' (paraboliod) کے حجم کو شمار کرنے میں آسانی پیدا کر دی۔

ابوکامل[3] نے الجبرا پر کتاب لکھی۔ یہ کتاب مربع مساواتوں کے حل الجبرا کے جیومیٹری پر اور دیا فنطسی تحلیل (diophantine equations) کی مساوات پر اطلاق سے متعلق ہے۔ اسے پہلا ریاضی دان سمجھا جاتا ہے جس نے غیر منطقی اعداد کو بطور حل اور مساوات کے 'عددی سر' (coefficients) کے طور پر استعمال اور قبول کیا۔ اس کے ریاضیاتی طریق کار کو بعد ازاں

[1] Pierre de Fermat: پائری ڈی فرمٹ (1601ء-1665ء) ایک فرانسیسی قانون دان اور ریاضی دان تھا۔ اس نے تجزیاتی جیومیٹری امکانیات اور بصریات میں قابل ذکر تحقیق کی۔

[2] Rene Descartes: رینے ڈیکارٹ (1596ء-1650ء) ایک فرانسیسی سائنسدان اور ریاضی دان تھا جس نے ریاضی میں Analytic geometry میں نمایاں کام کیا۔

[3] ابوکامل شجاع بن اسلم بن محمد بن شجاع الحاسب (850ء-930ء) ایک مصری انجینئر اور حساب دان تھا۔ اسے خوارزمی کے بعد سب سے بڑا حساب دان مانا جاتا ہے۔ وہ تیرہویں صدی عیسوی تک یورپ کے سائنسدانوں کے لیے ریفرنس رہا۔

اطالوی ریاضی دان فبیو ناشی[1] نے اختیار کیا اور اس قابل بنایا کہ وہ یورپ کو الجبرا سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کرے۔ وہ پہلا مسلمان ریاضی دان تھا جو الجبرائی مساوات کو بہ آسانی 'X2' (تا X8) حل کرتا ہے اور وہ 'غیر مخطط ہمزاد مساوات (non-linear simultaneous equations) کو تین متغیرہ مقداروں کے سیٹ حل کر سکتا تھا۔ اس نے سب قضیوں کو خطیبانہ انداز میں لکھا اور اس کی بعض کتابوں میں ریاضیاتی ترقیم موجود نہیں۔ مثال کے طور پر وہ X5(i.e،X2X2X) کے لیے عربی اظہار 'مل مل شئے' (mal mal shay) (مربع مربع چیز) استعمال کرتا ہے۔ اس نے الخوارزمی کی تصانیف کی اصلاح کی اور جیومیٹری کو حروف تہجی کے طور پر مرتب کیا۔ اس کی تحقیق میں چوکور مساوات 'ضرب' الجبرائی مقداریں اور جذروں کی جمع اور منفی بھی شامل ہیں۔

(6) علم فلکیات

علم فلکیات خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں شروع ہوا۔ یہ 'سریا سدھانتا'[2] سے بہت متاثر تھا جو ہندوستان سے بغداد لائی گئی اور اس کا محمد بن ابراہیم الفزاری[3] اور الخوارزمی نے عربی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں عہد ساسانی میں مرتب کردہ پہلوی جدول کے گوشواروں (Pahlavi tables (zij)) اور یونانی علم فلکیات کی کتب کے عربی زبان میں تراجم کیے گئے۔ بطلیموس کی

---

[1] Leonardo Pisano Bigollo: لیونارڈو بوناکسی (1170ء۔1250ء) المعروف فبیو ناشی ایک اطالوی ریاضی دان تھا۔ وہ عہد متوسط کا ایک نہایت ذہین ریاضی دان شمار ہوتا تھا۔ اس نے مغربی دنیا میں ہندو عربی شماریاتی نظام متعارف کروایا۔

[2] Surya Siddhanta: سُریا سدھانتا ہندوستانی علم فلکیات کے متعلق متعدد مقالوں کا نام ہے۔ اس میں روشنی پھیلانے والی چیزوں کی حرکات کا تعین کرنے کے قواعد بیان کئے گئے ہیں جو آسمان میں ان کے حقیقی مقامات کی تصدیق کرتے ہیں۔

[3] محمد ابن ابراہیم انفزاری ایک مسلمان فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔

تصنیف المماجسٹ[۱] کے بھی عربی میں کئی تراجم ہوئے۔

الخوارزمی نے فلکیات پر ایک گرانقدر مقالہ لکھا اور اپنے گوشوارے (zij) مرتب کیے جن پر دو صدیوں کے بعد ایک سپینی ماہر فلکیات مسلمہ المجریطی نے نظرثانی کی اور اڈیلارڈ آف باتھ[۲] نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کر دیا۔ یہ گوشوارے بعد ازاں فلکیاتی سرگرمیوں کی بنیاد بنے جبکہ یونان اور ہندوستان کے فلکیات کے تمام یونانی گوشوارے کی جگہ نئے گوشوارے نے لے لی۔

مامون الرشید[۳] نے اپنی سلطنت میں متعدد مقامات پر جدید ترین آلات سے لیس رصدگاہیں قائم کر رکھی تھیں جن سے سورج کے نقاط اعتدالین (equinoxes)، گہن، دمدار سیاروں کا ظہور اور دیگر آسمانی مظاہر دیکھے جا سکتے تھے۔ زمین کا حجم بحر احمر کے ساحلوں سے ایک زاویہ ناپنے سے معلوم کر لیا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپ پوری دل جمعی سے زمین کے چپٹی ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا۔

ابوالحسن کا دور بین ایجاد کرنا فلکیاتی مشاہدات کی طرف نہایت اہم قدم تھا۔ الخوارزمی کی کامیابیوں میں سے اہم ترین کامیابی ارض پیمائی کے سلسلے میں تھی۔ یہ زمین کے حجم اور اس کے محیط کے تعین کا طریق کار تھا۔ زمین ناپنے کا عمل میدانِ 'سنجر' (ایران) اور 'پامیرا' (شام) میں کیا گیا۔ اس کا حاصل نتیجہ 5632 عربی میل نکلا جو سماوی نصف النہار کے ایک درجے کی لمبائی تھی۔ یہ حیرت انگیز طور پر ایک صحیح نتیجہ تھا۔ یہ اس جگہ کے درجے کی حقیقی لمبائی سے تقریباً 2877 فٹ زیادہ تھا۔ اس پیمائش نے وہ تخمینہ مہیا کر دیا جو زمین کے قُطر کی لمبائی 6500 میل ظاہر کرتا

[۱] Al-magest: المماجسٹ دوسری صدی کا ریاضیاتی اور فلکیاتی مقالہ ہے جو ستاروں کی ظاہری حرکات اور سیاروی راستوں کے بارے میں ہے۔ یہ رومن عہد کے مصری سکالر بطلیموس نے یونانی زبان میں لکھا۔

[۲] Adelard of Bath: اڈیلارڈ (1080ء-1152ء) انگلش فلاسفر تھا۔ اس کی وجہ شہرت عربی زبان سے لاطینی اور جرمن میں کتب کے ترجمہ کرنے سے ہے۔

[۳] مامون الرشید بن ہارون الرشید (786ء-833ء) ساتواں عباسی خلیفہ تھا۔ اس کی دانائی، عزم، بردباری، علم دوستی، رائے، تدبیر، ہیبت، شجاعت، عالی حوصلگی اور فیاضی کی وجہ سے علم کے مختلف شعبہ جات نے بہت ترقی کی۔

تھا جبکہ اس کا محیط 20400 میل بنتا تھا۔ یہ حالیہ جدید پیمائش (values)، 111.3 کلومیٹر فی درجہ قطر اور 40068 کلومیٹر محیط کے بہت قریب تھا[1]۔

جابر بن سنان البتانی[2] ایک ممتاز ماہر فلکیات تھا۔ اس کے گوشواروں (tables) کے ترجمے نے کئی صدیوں تک یورپ کو فلکیاتی تحقیقات کے لیے ایک بنیاد فراہم کی۔

اس نے سورج کے حلقہ نما گرہنوں (annular eclipses) کا امکان ثابت کیا اور دائرۃ البروج کی خمیدگی، مدارینی سال (tropical year) کی طوالت، موسموں کے اختتام اور سورج کے بیضوی مدار کی اوسط کا نہایت درستی سے تعین کیا۔ فلکیات میں البتانی کے کارہائے نمایاں میں سے ایک شمسی سال کے دورانیے کا صحیح تعین تھا جو 365 دنوں، 5 گھنٹوں، 46 منٹوں اور 24 سکینڈوں پر مشتمل نکلا۔ اس نے بطلیموس کے اخذ کردہ نتائج کو درست کیا اور سورج اور چاند کے نئے گوشوارے (tables) مرتب کیے جو طویل عرصے تک مستند مانے جاتے رہے۔ اس کی بعض پیمائشیں کاپرنیکس[3] کی لی ہوئی پیمائشوں سے بھی زیادہ درست نکلیں جو کئی صدیاں بعد لی گئی تھیں۔ البتانی کی کتابیں مغرب کی سائنس اور فلکیات کے ارتقاء کے لیے نہایت اہم ذریع سمجھی جاتی ہیں۔ کاپرنیکس، البتانی کے تحقیقی کام کا اتنا معترف تھا کہ اس نے اپنی کتاب De Revolutionibus Orbium Coelestium میں اس کا 23 بار حوالہ دیا۔ البتانی کا ذکر

[1] Mathematical Geography, p. 187 - 188

[2] Albategnius: جابر بن سنان البتانی (858ء-929ء) کا شمار دنیا کے عظیم ترین فلکی سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ وہ اہم نظریات ہیں جو انہوں نے اس میدان میں وضع کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جبر، حساب اور مثلثات میں بھی کافی نظریات متعارف کروائے۔

[3] Nicolaus Copernicus: نکولس کاپرنیکس (1473ء-1543ء) ایک معروف ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔ اس نے پہلی دفعہ زمین کی بجائے سورج کا کائنات کے مرکز ہونے کا نظریہ پیش کیا۔

'Commentariolus'[۱] میں بھی آیا ہے۔ جان کیپلر اور گیلیلیو[۲] نے اس کے بعض مشاہدات میں دلچسپی لی اور اس کا معلوماتی مواد (observational data) جیوفزکس (Geophysics) میں آج تک استعمال ہو رہا ہے[۳]۔

البیرونی کی کتاب 'القانون المسعودی' علم فلکیات کی قاموس (Encyclopedia) ہے جس میں البتانی کے مشاہداتی مواد (observational data) کو بطلیموس کے 'ساکت شمسی اوج' (immobile solar apogee) کو رد کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے گرہن کی معلومات (observational data) کو 1749ء میں 'رچرڈ ڈنھورن'[۴] نے چاند کے اسراع (acceleration) کے تعین میں مدد کے لیے استعمال کیا۔ اس کا مشاہداتی مواد (observational data) ڈیٹا وسیع تر فلکیاتی تاریخی ریکارڈ میں شامل ہو گیا اور آج بھی جیوفزکس (Geophysics) اور فلکیات میں استعمال ہوتا ہے[۵]۔

ملک شاہ سلجوقی[۶] نے نیشاپور میں (1974ء یا 1975ء) میں ایک رصدگاہ قائم کی جہاں عمر خیام

---

[۱] Commentariolus چالیس صفحات پر مشتمل نظام اجرام فلکی کے بارے میں ایک مختصر خاکہ ہے جس میں اجرام فلکی کا مرکز زمین کی بجائے سورج قرار دیا گیا ہے۔

[۲] Galileo Galilei: گیلیلیو (1564ء-1642ء) ایک اطالوی ماہر فلکیات اور فلسفی تھا جس نے اشیا کی حرکات، دوربین، فلکیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ اسے جدید طبیعیات کا باپ کہا جاتا ہے۔

[۳] Dictionary of Scientific Biography, Vol.1, p. 507-516

[۴] Richard Dunthorne: رچرڈ ڈنھورن (1711ء-1775ء) ایک برطانوی ماہر فلکیات اور مساحت کار تھا جو کیمبرج میں کام کرتا تھا۔

[۵] Historical Eclipses and Earthis Rotation, p. 431

[۶] I-Malik Shah: ملک شاہ اول سلجوق (1055ء-1092ء) سلجوقی سلطنت کا تیسرا حکمران تھا جو اپنے والد الپ ارسلان کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا اور 1072ء سے 1092ء تک حکمران رہا۔

اور ابو الفتح الخازنی[1] نے ایسے فلکیاتی مشاہدات کیے جن کی بنا پر عیسوی تقویم (Gregorian calendar) سے 600 سال قبل ایک اصلاح شدہ کیلنڈر وجود میں آ گیا تھا۔ اس کیلنڈر کو 'التاریخ جلالی'[2] کہا جاتا تھا۔ یہ مداری سال (tropical year) کی طوالت کے بالکل صحیح تعین پر مبنی ہے۔ عیسوی کیلنڈر (Gregorian calendar) 3330 سالوں میں ایک دن کی غلطی دکھاتا ہے جبکہ خیام کا التاریخ جلالی کیلنڈر 5000 سال میں ایک دن کی غلطی گنجائش ہے۔

سمرقند میں ایک فلکیاتی کیلنڈر 'تقویم الغ بیگ'[3] 1437ء میں مرتب کیا گیا۔ یورپ میں اسے بہت پسند کیا گیا اور اٹھارہویں صدی میں انگلستان میں اسے شائع کیا گیا۔ فلکیات کے شعبے میں مسلمانوں کی خدمات ستاروں کے ناموں سے عیاں ہیں۔ کئی ستاروں کے سرکاری نام اور فلکیات کی فنی اصطلاحیں ان کے عربی مخرج سے وضع کی گئی ہیں۔ ان کی چند مثالیں درج ذیل ہیں[4]:

ستاروں کے نام

ستاروں کے نام/فنی اصلاح	عربی ماخذ
عقرب (Acrab)	عقرب

---

[1] Al-Khazini: ابوالفتح عبدالرحمن ابوجعفر الخازنی (گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی) کے ایک عظیم سائنسدان ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام میزان الحکمہ ہے جس میں تمام پیمانے جمع کیے گئے اور وزن کی وجوہات بیان کی گئیں ہیں۔ الخازنی نے فزکس اور میکینکل میں بھی کام کیا اور فلکیاتی ٹیبل بھی بنائے۔ ہوا اور پانی میں اجسام کا وزن کرنے کے لیے خاص پیمانے بنائے۔

[2] تاریخ الجلالی المعرف جلالی کیلنڈر دراصل ایرانی قدیم شمسی کیلنڈ کی نئی شکل ہے جسے عمر خیام اور اسکے ساتھیوں نے سلطان جلال الدین ملک شاہ اول سلجوقی کے کہنے پر بنایا تھا۔ سلطان جلال الدین کے نام پر کیلنڈر کا نام جلالی تقویم کیلنڈر رکھا گیا تھا۔

[3] مرزا الغ بیگ (1394ء-1449ء) ایران کی تیموری سلطنت کا تیسرا حکمران اور امیر تیمور کا علم دوست پوتا تھا جو 1447ء سے 1449ء تک حکمران رہا۔ سمرقند کی گورنری کے دوران اس نے ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کی۔

[4] The Arabs, p.572 - 573

الگیدی(Algedi)	الجدی-دادا
الطائر(al-Ta'ir)	الطیر-اڑنے والا
دینب(Deneb)	ذنب-دم
فرقد(Pherkad)	فرقد-بچھڑا
نادر(Naadir)	نذیر-مبلغ

علم فلکیات میں عربوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے رابرٹ بریفالٹ نے کہا:

Arab astronomy did not forestall Copernicus or Newton, though without it there would have been no Copernicus and Newton[1].

(اگرچہ عرب ماہرین فلکیات نے کاپرنیکس یا نیوٹن کی پیش بینی نہیں کی تھی لیکن اس کے بغیر کوئی کاپرنیکس اور نیوٹن نہ ہوتا)

علم فلکیات میں عرب دانشوروں نے بہت پیش رفت کی تھی جس کے نتیجے میں نظام بنے اور وہ آج تک موجود ہیں۔

(7) جغرافیہ

مسلمانوں نے جغرافیے میں بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ مسلمان جغرافیہ دانوں کی دریافتوں (innovations) کا آغاز ان کی جانب سے زمین کے گول ہونے کا ثبوت لانے سے ہوا۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ زمین 'دائرہ نما چیز' (circular object) ہے اور تمام اطراف سے پانی سے گھری ہوئی ہے۔ سلطنت روما نے اس تصور کو رد کر دیا۔ بعد میں مسیحی کلیسا اوران کے آباؤ اجداد نے 'لاکتانتیوس[۲] کی زیر قیادت زمین کے دائرہ نما چیز ہونے کے نظریئے

---

[1] The Making of Humanity, p. 190

[۲] Lucuis caecilius firmiamus lactanius: لاکتانتیوس (250ء-325ء) ایک مسیحی مصنف تھا جو بعد میں پہلے مسیحی رومن بادشاہ قسطنطین اول کا ایک مشیر بن گیا۔

کو شدت کے ساتھ اختیار کر لیا۔ مسیحی کلیسا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین چپٹی ہے جبکہ اس کا دوسرا رخ غیر آباد ہے، ورنہ لوگ خلا میں جا گرتے۔ مسلمانوں نے زمین کی گولائی کا نظریہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ابن خرددادبہ[1] اور الادریسی[2] نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین گیند کی طرح گول ہے۔ پانی بھینچ کر اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور قدرتی طور پر اس کے اوپر اور تسلسل کے ساتھ رہتا ہے۔ زمین اور پانی دونوں کائنات میں اس حالت میں رہتے ہیں جیسے انڈے کے اندر سفیدی اور زردی رہتے ہیں۔ وہ مرکز میں موجود رہتے ہیں اور انہیں تمام اطراف سے ہوا (فضا) نے گھیرا ہوا ہے[3]۔

الادریسی نے دنیا کے نقشے بنائے۔ یہ عہد متوسط میں نقشہ نگاری کے سب سے بڑے نقشے تھے جو مکمل ترین، صحیح ترین اور مفصل نقشے تھے۔ اتنے جامع و مفصل نقشے دنیا میں پہلی بار وجود میں آئے تھے۔ بیشتر مسلم سائنسدانوں کی طرح الادریسی نے زمین کے گول ہونے کا ادّعا کیا اور کہا کہ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے[4]۔

مسلمانوں نے زمین کی گولائی کا دعویٰ کاپرنیکس سے بہت پہلے کر دیا تھا۔ الادریسی نے سسلی کے نارمن بادشاہ راجر دوئم[5] کے لیے ایک جدول 'نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق'[6] تیار کی۔ اس نے یہ جدول دربار میں قیام کر کے اٹھارہ سال میں مکمل کی۔ جہاں وہ دن رات نقشہ سازی اور

---

[1] ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ بن خرددادبہ (820ء - 912ء) خلافت عباسیہ کا ایک انتظامی جغرافیہ دان، بیوروکریٹ اور مصنف تھا۔

[2] الادریسی (1099ء-1154ء) ایک اندلسی عرب نقشہ نویس، جغرافیہ دان اور سیاح تھا۔

[3] Nozhat Al Mushtak fi Ikhtrak Al-Afak, p. 7

[4] The Story Of Civilization, Vol. 13. p. 358.

[5] Roger II: راجر دوئم (1099ء-1154ء) سسلی کا بادشاہ تھا۔

[6] Tabula Rogeriana: نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق دنیا کی معلومات اور نقشہ جات پر مشتمل کتاب ہے جسے مشہور مسلمان جغرافیہ دان الادریسی نے تیار کیا۔

توضیحات نگاری میں مصروف رہتا۔ اس کے نقشوں نے کولمبس[1] اور واسکوڈے گاما[2] کے بحری اسفار میں ان کی بڑی مدد کی۔

مامون الرشید نے زمین کے ابعاد (dimensions) کی پیمائش کا فیصلہ کیا اور یہ کام فلکیات دانوں اور جغرافیہ دانوں کی دو جماعتوں کے سپرد کیا۔ ان جماعتوں کو دو مختلف اطراف، ایک کو مشرق اور دوسری کو مغرب کی جانب بھیجا۔ پھر انہیں طول البلد کا ایک درجہ (ان خطوط کی کل تعداد 360 ہوتی ہے) ناپنے کے لیے کہا۔ ان دو جماعتوں کی اوسط پیمائش تقریباً 56.66 میل نکلی جبکہ موجودہ سائنس کی اوسط پیمائش 56.93 میل ہے۔ ان دو جماعتوں نے قطر (موٹائی) کی بھی پیمائش کی جو تقریباً 41,248 کلومیٹر ہے جب کہ اس وقت کے حساب سے یہ 40,070 کلومیٹر ہے۔ یعنی مامون الرشید کی جماعتوں کی پیمائش میں غلطی 3 فیصد سے زیادہ نہیں[3]۔

ابوعلی حسن مراکشی[4] نے دنیا کے نقشوں پر طول بلد اور عرض بلد کے خطوط لگائے تا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اوقاتِ نماز مقرر کرنے میں مدد ملے اور اس سے انہیں جغرافیائی نقشے میں خطوط لگانے میں آسانی حاصل ہوگئی۔ اسلامی نقشے اور بحری سائنسز (marine sciences) کے بارے میں مسلمانوں کی مطبوعات نے مغربی دنیا کی جہاز رانی کو نمایاں طور پر متاثر کیا ہے۔

---

[1] Christopher Columbus: کرسٹوفر کولمبس (1451ء-1506ء) ایک بحری مہم جو تھا جس نے 1492ء میں امریکہ کو دریافت کیا۔

[2] Vasco da Gama: واسکوڈے گاما (1460ء-1524ء) ایک پرتگالی بحری قزاق تھا جس نے جنوبی افریقہ کے گرد گھوم کر ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا۔

[3] Treasures of Astronomy, p. 25

[4] ابوعلی حسن مراکشی (تیرہویں صدی عیسوی) ایک نامور جغرافیہ دان، حساب دان اور ماہر فلکیات تھے۔

علی بن عمر الکاتبی[۱]، قطب الدین شیرازی[۲] اور الفراغ علی تاریخ انسانی کے اولین سائنسدان تھے، جنہوں نے سورج کے گرد زمین کی ممکنہ مداروی حرکت کا حوالہ دیا اور کہا کہ رات اور دن میں زمین ایک چکر پورا کرتی ہے۔ جارج سارٹن[۳] جسے بیشتر لوگ بابائے تاریخ سائنس سمجھتے ہیں۔اس نے اپنی کتاب 'Introduction to the History of Science' میں لکھا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے دوران ان تین سائنسدانوں کی تحقیق نوٹس میں آئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ ان عوامل میں سے ایک ہے جنہوں نے کاپرنیکس کی 1543ء میں اعلان کردہ تحقیق کو متاثر کیا[۴]۔

البیرونی نے موجودہ پاکستان کے علاقے (Rohtas Fort) میں زمین کے قطر (radius) کی پیمائش کی جو عہد حاضر کے تسلیم شدہ قطر سے صرف 15 کلومیٹر کم ہے۔

مسلمانوں نے اپنے علم جغرافیہ کی بدولت سمندری راستوں اور سیاحت پر کنٹرول حاصل کرلیا تھا۔ مشہور پرتگیزی ملاح واسکوڈے گاما نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان وہ بحری راستہ دریافت کرلیا جو راس امید[۵] کی طرف سے ہوکر جاتا تھا۔ یہ عظیم بحری دریافت مسلم عرب ملاح

---

[۱] علی بن عمر بن علی الکاتبی المعروف نجم الدین الکاتبی القزوینی (1203ء-1277ء) مسلمان جغرافیہ دان، ماہر فلسفہ و منطق، ماہر علم فلکیات اور ریاضی دان تھا۔ علم منطق پر اس کی کتاب الرسالہ الشمسیہ فی القواعد، سائنسی علوم اور مابعد از طبیعات پر کتاب حکمت العین معروف ہیں۔

[۲] قطب الدین محمود شیرازی (1236ء-1311ء) ایک ماہر فلکیات، ریاضی دان، طبیب، ماہر فزکس، ماہر علم موسیقی، فلاسفر اور صوفی تھا۔ اس نے ان تمام شعبہ جات میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

[۳] George Alfred Leon Sarton: جارج الفریڈ لی اون سارٹن (1884ء-1956ء) ایک امریکی کیمیا دان اور مورخ تھا جسے شعبہ سائنس کی تاریخ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

[۴] Introduction to the History of Science, vol. 1, p. 46

[۵] Cape of Good Hope: راس امید جنوبی افریقہ کے ساحلوں پر واقع راس (rocky) ہے۔ واسکوڈے گاما نے افریقہ کے گرد گھوم کر انڈیا اور یورپ کے درمیان سمندری راستہ دریافت کیا جس کے بعد یہ علاقے یورپی قابض قوتوں کی نوآبادیاں بن گیا۔

احمد بن ماجد[۱] کی مدد سے ممکن ہوئی تھی جس نے 1498ء میں واسکوڈے گاما کو افریقہ سے ہندوستان تک پہنچنے میں رہنمائی کی۔اسے اس ملاح کی خدمات موزمبیق[۲] کے مسلم سلطان نے فراہم کی تھیں[۳]۔

مسلمانوں کا نئی دنیا، امریکہ کی دریافت میں بھی اہم کردار تھا۔کولمبس نے امریکہ 1506ء میں دریافت کیا تھا۔امریکی سکالر فلپ ہٹی لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے زمین کے گول ہونے کے نظریے کو جس کے بغیر امریکہ کی دریافت ممکن نہ تھی۔اس نظریئے کا علمبردار ایک مسلمان سائنسدان ابوعبیدہ مسلم البالینی تھا جس نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔اس کے نظریات دسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں خوب پھیلے اور مشہور ہوئے۔اس طرح زمین کے گول ہونے کا نظریہ عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوکر 1410ء میں یورپ میں شائع ہوا۔اس کو پڑھ کر کولمبس نے اس نظریہ سے واقفیت حاصل کی[۴]۔

(8) قانون

مسلمان علما اور مدارس نے قانون (فقہ) اور اصول قانون (اصول فقہ) کے شعبوں میں بھی نمایاں اور قابل قدر خدمات انجام دیں۔سابق تہذیبوں کے اپنے مخصوص طور طریقے ہی قانون ہوتے تھے۔تاہم قانون اب بطور ایک سائنس (مجرد وجود اور قوانین وقواعد سے جداگانہ تشخص

---

[۱] شہاب الدین احمد بن ماجد (پندرہویں صدی عیسوی) ایک عرب جہاز راں تھا جس نے واسکوڈے گاما کی ہندوستان کا راستہ دریافت کرنے میں اس کی مدد کی۔اس نے علم بحریات پر ایک ایسی کتاب تصنیف کی تھی جس میں بحر ہند، بحر قلزم، خلیج فارس، بحیرہ چین کے مغربی حصے اور مجمع الجزائر میں جہاز رانی کی ہدایات درج ہیں۔

[۲] جمہوریہ موزمبیق افریقہ کے جنوب مشرق میں واقع ایک ملک ہے جس کا دارالحکومت ماپوتو ہے۔اس کی سرحدیں مشرق میں بحر ہند، شمال میں تنزانیہ، شمال مغرب میں ملاوی اور زیمبیا، مغرب میں زمبابوے اور جنوب مغرب میں جنوبی افریقا اور سوازی لینڈ سے ملتی ہیں۔

[۳] Encyclopedia Britannica Vol 7, p. 761

[۴] The Arabs, p. 570

کی حامل) ہے جو اسلام سے پہلے موجود نہیں تھا۔ فقہ خالصتاً ایک مسلم دریافت ہے۔ روم، یونان، چین، ہندوستان اور عراق میں اسلام کی آمد سے بہت پہلے قانون کے کئی شعبے موجود تھے لیکن فقہ، حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تصنیف 'کتاب الرائے' سے شروع ہوئی۔ ان کے شاگرد حضرت امام ابو یوسفؒ[1] نے کتاب الاصول لکھی اور حضرت امام شافعیؒ[2] نے انسانی تاریخ میں پہلی بار اپنی کتاب الرسالہ فی اصول الفقہ میں اصول قانون، قانون سازی، تعبیر کے اصولوں وغیرہ پر باقاعدہ سیر حاصل بحث کی۔

مسلم فقہا نے تاریخ میں پہلی بار 'نیت' (ارادہ) کی اہمیت واضح کی اور اس تصور پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے بنیادی الفاظ اس حدیث 'إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'[3] (اعمال کا دارومدار نیت پر ہے) سے ماخوذ ہیں۔ فقہا نے 'سخت مواخذے' (culpability without criminal intention) کی حوصلہ شکنی کی۔ یہ نظریہ 'نیت' ہے اور یہ فوجداری اصول قانون میں ایک مسلمہ حقیقت رکھتا ہے کیونکہ قانون ایسے اقدام کو جرم نہیں مانتا جس میں ارادۂ جرم شامل نہ ہو۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریاست مدینہ کے لیے اولین تحریری دستور دیا۔ یہ تحریری دستور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیار کرایا، باون (52) شقوں پر مشتمل ہے۔ اس میں متعدد اصول طے کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً حکمران اور رعیت کے علیحدہ علیحدہ حقوق و فرائض، قانون سازی، انصاف کا قیام، نظام دفاع، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک، دوطرفہ بنیاد پر سماجی بیمہ کاری اور اس دور کے دیگر تقاضوں کا بندوبست وغیرہ۔

مسلمانوں نے ہی پہلی بار مختلف اقوام کے تقابلی قوانین کا باضابطہ مطالعہ کیا۔ انہوں نے متنوع

---

[1] امام ابو یوسفؒ (735ء-798ء) امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد اور حنفی مذہب کے امام تھے۔ آپؒ کا اصل نام یعقوب بن ابراہیمؒ تھا۔ آپؒ تاریخ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جن کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے خطاب سے نوازا گیا۔

[2] محمد بن ادریس بن العباس شافعیؒ (768ء-820ء) ایک مشہور و معروف فقیہ تھے۔ جنہوں نے ایک نئے مسلک شافعی کی بنیاد ڈالی۔ آپؒ کی کتاب الرسالہ اصول فقہ کی پہلی کتاب ہے۔

[3] صحیح بخاری، ج:1، رقم الحدیث:1

بیرونی قوانین کے بنیادی اصولوں کے اسلامی قوانین سے فرق و امتیاز پر بحث کی۔ نیز اسلام کے قانونی پہلوؤں کی مختلف تعبیرات کے مابین اصول فقہ کے لحاظ سے امتیاز کا بھی جائزہ لیا۔
عام طور پر جنگی حالات میں قانون معطل ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں کسی سے معقول اور منصفانہ رویہ اپنانے کی کم سے کم توقع کی جاتی ہے۔ اس لیے برسر پیکار ریاستوں کے فرمانرواؤں نے ہمیشہ اسے اپنا استحقاق سمجھا کہ وہ دشمن کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں۔ مسلمانوں نے پہلی بار عمومی بین الاقوامی قانون (Public International Law) کو ریاستی حکمرانوں کی متلون مزاجی پر مبنی قانون سے الگ کیا اور اسے خالصتاً قانونی بنیادوں پر استوار کیا۔ بین الاقوامی قانون کا ضابطۂ کار حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ایک استاد حضرت امام زید بن علی زین العابدینؒ نے اپنی تصنیف 'کتاب المجموعہ' میں متعارف کرایا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ایک شاگرد حضرت امام محمد الشیبانیؒ[۱] نے اس موضوع پر دو کتابیں کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر لکھیں۔ جن کا انگریزی ترجمہ امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے عیسائی پروفیسر مجید خدوری نے کیا اور دستیاب ہے۔ حضرت امام سرخسیؒ نے اس کتاب کی شرح چار جلدوں میں لکھی۔ یہ کتاب Oppenheim کی کتاب بین الاقوامی قانون (International Law) سے بھی بڑی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ بین الاقوامی قانون پر پہلی باقاعدہ کتاب ولندیزی عالم ہوگو گروشئیس[۲] نے 1645ء میں لکھی تھی جس کا نام

De Jure Belli ac Pacis

(Law of War and Peace) ہے۔

مسلم فقہا نے حقوق اور فرائض کے باہمی تعلق کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اگر انسان کے

---

[۱] امام محمد بن حسن شیبانیؒ (749ء-805ء) امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور مشیر خاص تھے۔ امام ابو یوسفؒ کے بعد آپؒ جید شاگرد تھے۔ استاد کے نظریات کو تدوین کرنے میں ان کی محنت بھی شامل تھی۔ آپؒ نے بین الاقوامی قانون پر کتاب السیر لکھی۔
[۲] Hogo Grotius: ہوگو گروشئیش (1582ء-1645ء) ایک ولندیزی ماہر قانون تھا۔

حقوق و فرائض کو لازم و ملزوم نہ کیا جائے تو بنی نوع انسان ایک غارت گر جانور، بھڑیا یا شیطان بن جائے گا۔

اسلام قوانین کو فطرت انسانی کی پسند اور نا پسند کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھائی اور برائی کے درمیان فرق و امتیاز کی تصریح کرتا ہے۔ قرآن پاک چند چیزیں لازماً کرنے (معروف) اور چند چیزوں سے لازماً اجتناب کرنے (منکر) کا حکم دیتا ہے۔ معروف کا مطلب ہے کہ 'اچھائی' وہ ہے جس کے اچھا ہونے کا علم ہر کسی کو ہے۔ اس لیے اس کا حکم دیا گیا ہے (یا اسے ترجیح دینے کے لیے کہا گیا ہے) جب کہ منکر کے معنی ایک ایسی چیز ہے جس کی ہر کوئی مذمت کرتا ہے اس لیے وہ ممنوعہ ہے۔ اسلامی قوانین کا بہت بڑا حصہ اسی نظریئے پر استوار ہے۔

عمومی طور پر جو مادی ترغیبات یا موانع (sanctions) ایک قانون کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں، وہ اسلام میں بھی اسی طرح ہیں جیسے دیگر نظامہائے قانون میں ہوتے ہیں۔ تاہم پیغمبر اسلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں ایک زائد ترغیب شامل کر دی ہے جو مادی ترغیب کی بہ نسبت شاید زیادہ موثر ہے اور وہ روحانی ترغیب ہے۔

اسلام نے انصاف کے نظام کے قیام کے لیے جملہ لوازم فراہم کرتے ہوئے اپنے پیروکاروں کے ذہنوں میں موت کے بعد قائم ہونے والے روز محشر، اللہ تعالیٰ کی عدالت کے فیصلوں اور دنیا میں کیے گئے اعمال کے نتیجے میں نجات یا جہنم کے فیصلوں کے تصورات راسخ کیے ہیں۔ اس طرح ایک مومن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض پورے کرے جبکہ اسے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا بھی پورا موقع دیا گیا ہے۔ حرام سے روکا گیا ہے باوجودیکہ حرام میں کئی ترغیبات ہیں۔ مادی جواز اور روحانی جواز، ایک دوسرے کی اثر انگیزی کے لیے باعث تقویت بنتے ہیں۔ روحانی جواز قوانین کی زیادہ سے زیادہ پابندی کرنے اور کروانے، حقوق و فرائض کا زیادہ سے زیادہ احترام کرنے اور کروانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے قرآن پاک وحی الٰہی ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے مقدس متن کی توضیح وتشریح فرمائی۔ ان توضیحات وتشریحات کو بطور 'حدیث' قلم بند کرنے کی ہدایات دیں۔قرآن وحدیث کی تعلیمات ناقابل تنسیخ ہیں۔ یہ نظریاتی سختی (doctrinal rigidity) نظریۂ اجتہاد کے تحت اس وقت نرم و لچکدار بن جاتی ہے جب انسانوں کو دِقت طلب واقعات وحالات سے توافق اختیار کرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ قوانین خواہ وہ کتاب الٰہی سے ماخوذ ہوں یا ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخذ کئے گئے ہوں۔ وہ ہرگز یکساں درجے کے حامل نہیں ہیں۔ ان میں سے صرف چند ایک ہی بطور فریضہ (obligatory) عائد ہوتے ہیں جبکہ دیگر قوانین سفارشات کا درجہ (recommendatory) رکھتے ہیں جو افراد کو خاصی گنجائش دیتے ہیں۔ قانون کی تعبیر وتوضیح کی جاسکتی ہے۔تعبیرات و توضیحات ایسے امکانات پیدا کر دیتی ہیں کہ قانونِ خداوندی، خصوصی حالات سے موافقت پیدا کرلیتا ہے۔ اکثریت کو جب بھی اور جیسی بھی ضرورت ہو وہ اس کے لیے قانون سازی (legislation) کرسکتی ہے۔حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لیے قاعدہ وضع فرما دیا ہے:

لا تَجْتَمِعُ اُمَّتی علی ضلالَۃِ[1].

(میری امت کسی غلط رائے پر متفق نہیں ہوگی)

اسلام قانون سازی میں انسانی عقل پر اعتماد کرتا ہے۔ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت

[1] مشکٰوۃ المصابیح، ج:5، رقم الحدیث:317

معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی ہیں[1]۔

باالفاظ دیگر ایک فرد کی عقل عام پر مبنی کوشش نہ صرف قانون کے ارتقاء کا ذریعہ ہے بلکہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائے برکات کا مستحق بھی بن جاتی ہے۔

اسلام شہریوں کے مختلف گروہوں کی قانونی خود مختاری کا احترام کرتا ہے۔ یہ ہر مذہبی گروہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ اس کی اپنی عدالتیں ہوں جن کی سربراہی ان کے منصفین کریں تاکہ ان کے انسانی معاملات پر ان کے اپنے دیوانی اور فوجداری قوانین کا اطلاق ہو۔

اسلام نے مسلمانوں کے مابین قیام انصاف کے لیے تزکیۃ الشہود[2] کا تصور متعارف کرایا تاکہ گواہ کے قابل اعتبار ہونے کا تعین کیا جا سکے۔ مزید برآں قرآن پاک (سورۃ النور، آیت: 4) میں ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کی عصمت سے متعلق کوئی الزام لگاتا ہے اور عدل کے تقاضوں کے مطابق اس کا ثبوت نہیں دیتا تو وہ نہ صرف سزا کا حق دار ہوتا ہے بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے عدالتوں کے سامنے گواہی دینے کے لیے بھی نااہل قرار دے دیا جاتا ہے۔

اسلام نے 'عرف' پر مبنی عام طور پر مقبول، 'معروف' کی منظوری دے دی ہے۔ جس سے قانون کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔ 'معروف' کا تصور مسلمانوں کو ان رواجوں اور معمولات سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے جن کا کسی گروہ (community) میں رواج رہا ہے تاکہ مشترکہ بھلائی کے کاموں کو فروغ مل سکے۔ اس 'جاذبانہ رویئے' (assimilative behaviour) نے اسلامی قانون کو خوبیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک اعلان کرتا ہے کہ سابقہ

---

[1] سنن ابوداؤد، ج:3، رقم الحدیث:199

[2] تزکیۃ الشہود کے معنی یہ ہیں کہ عدالت اپنے اطمینان کے لیے گواہ کے قابل اعتماد ہونے کی تحقیقات کر لے۔

انبیا ورسل علیہم السلام پر جو وحی الٰہی اترتی تھی وہ مسلمانوں کے لیے بھی جائز و بجا ہے لیکن اس کا دائرہ صرف اس وحی تک محدود ہے جس کا مستند ہونا شک وشبہے سے بالاتر ہو[1]۔

(9) دیگر شعبہ جات

مسلمانوں نے فنون لطیفہ (Fine Arts) اور مخصوص قسم کی مصوری (paintings) اور خوشنویسی کو بہت ترقی دی ہے۔ انہوں نے کڑھائی (embroidery) اور قالین بافی سے آغاز کیا اور اسے ترقی دی۔ لکڑی، ہاتھی دانت اور ہڈیوں پر کندہ کاری شروع کی۔ مسلمانوں نے خوش نویسی، مصوری، شیشہ گری، ظروف سازی اور پارچہ بافی جیسے بصری فنون کو بے پناہ ترقی دی۔ خطاطی کے نمونے اسلامی آرٹ میں بے حد وحساب موجود ہیں۔ اس کے دو بڑے رسم الخط علامتی کوفی اور نسخ ہیں جنہیں دیواروں، گنبدوں، محرابوں اور منبروں کی اطراف میں طغروں (tughras) اور دھات کاری میں استعمال کرکے ان کے حسن کو بڑھانے میں مدد لی گئی ہے۔ خوشنویسی کے لیے استعمال ہونے والی زبانوں میں زیادہ تر عربی، فارسی (پرانی)، ترکی اور اردو ہیں۔

اسلامی دنیا میں پینٹنگ (رنگوں کے امتزاج اور استعمال) کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل منقش تحریر کا مصغر (miniature) ہے۔ رنگوں اور سونے کے پانی سے مزین مخطوطوں اور قلمی نسخوں کا مصغر، فارسی مصغر کی مقبول روایت ہے جو عثمانی مصغر اور مغل مصغر کو بہت متاثر کرتی ہے۔ توضیحی کتابوں (illustrated) کے بڑے شاہکار، فارسی شاعری کی قدیم کتابیں ہیں۔ ان میں فردوسی کا شاہنامہ اسلام، گلستان سعدی، دیوان حافظ اور دیگر بہت سی دیگر کتب شامل ہیں۔

قالین سازی ایک معروف اسلامی فن ہے۔ ان کی مہارت مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ ہنر، فرش کی پوشش (floor coverings) سے لے کر تعمیراتی تزئین تک اور گدیوں سے لے کر گاؤتکیوں، تھیلوں اور ہر شکل اور سائز کی بوریوں تک، مذہبی رسومات میں استعمال ہونے والی اشیا بالخصوص جائے نمازوں تک ہر چیز میں اپنے جلوے دکھا رہا ہے۔

---

[1] سورۃ الانعام، آیات: 84-87

قدیم ترین پبلک اسلامی عمارات جیسے کہ قبۃ الصخریٰ[۱] کی اندرونی دیواریں بازنطینی طرز کی کاشی کاری سے مزین کی گئی تھیں مگر ان میں انسانی شکلیں نہیں بنائی گئیں۔ تاہم صیقل شدہ چمکدار رنگوں کی اسلامی روایت کی حامل منفرد ٹائلیں جو اندرونی اور بیرونی دیواروں اور گنبدوں پر لگی ہوئی ہیں وہ نویں صدی عیسوی سے بننا شروع ہوئی تھیں۔ مغل، پچی کاری (parchin kari) کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ ایسی تزئین تھی جو جڑاؤ نیم گراں بہا پتھروں کے پینلز (panels) سے اور بعض صورتوں میں جڑاؤ جواہرات لگا کر کی جاتی تھی۔ جیسا کہ تاج محل[۲] میں دکھائی دے رہی ہے۔

کاغذ چین میں ایجاد ہوا تھا لیکن 751ء میں 'طلاس' کی جنگ (موجودہ کرغستان) میں چین کی شکست کے بعد یہ کام ساری اسلامی دنیا میں پھیل گیا۔ اسلامی دنیا میں کاغذ کے پہلے کارخانے کی بنیاد سمرقند (ازبکستان) میں ڈالی گئی۔ اس سے کاغذ سازی کے وقت کو کم اور معیار کو بلند تر کر دیا گیا۔ پھر مشینری کو اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال بنائے اور کاغذ کی شیٹ کو بھی معقول حد تک دبیز (thicker) بنا دے۔ اس طرح کاغذ سازی ایک بڑی صنعت میں تبدیل ہو گئی۔ شروع شروع میں پانی سے چلنے والی 'پلپ ملیں' (pulp mills) ہوتی تھیں جس میں کاغذ کی تیاری کے لیے 'ٹرپ ہیمر' (trip hammers) (انسان یا جانور کی قوت سے) استعمال ہوتا تھا۔ بعدازاں اس کی جگہ چین کے روایتی کھرل یا ہاون دستے نے لے لی[۳]۔

مسلمانوں نے کاغذ بنانے کے نئے نئے طریقے وضع کر کے انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی

---

[۱] Dome of the Rock: قبۃ الصخریٰ یروشلم/ بیت المقدس میں مسجد اقصی کے قریب موجود ایک تاریخی چٹان کے اوپر سنہری گنبد کا نام ہے۔ روایات کے مطابق معراج کی رات حضور نبی کریم ﷺ اس چٹان سے براق پر سوار ہو کر آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کثیر سرمائے سے چٹان کے اوپر گنبد تعمیر کرایا جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے۔

[۲] تاج محل بھارتی شہر آگرہ میں دریائے جمنا کے جنوبی کنارے پر واقع سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا محل ہے جو مغل شہنشاہ شاہجہان نے 1632ء میں اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کے مقبرے پر تعمیر کروایا تھا۔

[۳] Papermaking, p. 139

ہے۔کاغذ کی تجارتی پیمانے پر تیاری پہلے مراکش میں شروع ہوئی پھر سپین اور یورپ میں چلی گئی۔کاغذ کے بغیر اتنے وسیع پیمانے پر کتب کی اشاعت ممکن نہ تھی جو علم کی ترقی کا سبب بنیں۔ کاغذ کی پیمائش کا بنیادی پیمانہ 'ream' بھی عربی زبان کا لفظ ہے[1]۔

اگر موجودہ دور میں آپ اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں جائیں تو آپ کو ہر دوسرا آدمی غیر ملکی صلاح کار (consultant) دیکھنے کو ملے گا۔ایک وقت تھا کہ جب مغرب کو ماہرین اور مشیر ہم (مسلمان) مہیا کرتے تھے۔اوفاریکس نے سونے کے سکے ڈھلوانے کے لیے بغداد سے سکہ گر بلائے تھے۔وہ سکے اب بھی برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں جس میں ایک طرف تو بادشاہ کا نام لکھا ہوا ہے تو دوسری طرف عرب سکہ گر کا نام ہے۔

[1] http:/www.etymonline.com

3

مسلم علوم کی مغرب کو ترسیل

علوم کی جن شاخوں کی مسلمانوں نے آبیاری کی، سسلی، سپین اور روم کے راستے یورپ پہنچیں اور پھلی پھولیں۔ گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک عہد متوسط کا یورپ، اسلامی تہذیب کو جذب کرتا رہا جہاں یہ علوم چوٹی پر پہنچے ہوئے تھے۔ یورپ اور اسلامی دنیا کے متعدد نقاط اتصال تھے۔ یورپ کو ترسیلِ اسلامی علوم کے بڑے بڑے مقاماتِ اتصال سسلی اور سپین میں بالخصوص طلیطلہ (Toledo) میں تھے۔

بعدازاں 1085ء میں اس شہر کی سپینی عیسائیوں کے ہاتھوں فتح اور 1091ء میں نورمین[1] کے ہاتھوں اس کی استرداد[2] ہو جانے پر ایک زبردست نورمین عرب بازنطینی کلچر وجود میں آ گیا۔ مسلم جغرافیہ دان الادریسی نے

The Book of Pleasant Journey into Faraway Lands (Tobula Rogeriana)

لکھی۔ یہ کتاب عہد متوسط میں عظیم ترین جغرافیائی مقالوں میں سے ہے۔ الادریسی نے یہ کتاب سسلی بادشاہ راجر دوئم کے لیے لکھی تھی۔ صلیبی جنگوں نے بھی یورپ اور لیوانٹ[3] کے درمیان تبادلوں میں زیادہ گہما گہمی بڑھا دی۔

---

[1] Norman: نورمین دسویں اور گیارہویں صدی کا ایک خاندان تھا جس نے فرانس کے علاقے نورمینڈی (Normandy) کو اپنا نام دیا۔

[2] Reconquista: استردادعیسائیوں کی ساڑھے سات سوسال طویل ان کوششوں کو کہا جاتا ہے جو انہوں نے جزیرہ نما آئبیریا سے مسلمانوں کو نکالنے اور ان کی حکومت کے خاتمے کے لیے کیں۔ استرداد کا آغاز 722ء میں معرکہ کوواڈونگا سے ہوا اور اختتام 1492ء میں سقوط غرناطہ سے ہوا۔

[3] Levant مشرق وسطیٰ کے ایک بڑے علاقے کے لیے استعمال ہونے والی ایک غیر واضح تاریخی اصطلاح ہے۔ اس میں بحیرہ روم، مشرق میں صحرائے عرب کے شمالی حصوں اور بالائی بین النہرین اور شمال میں کوہ ثور کے درمیان کا علاقہ شامل سمجھا جاتا ہے۔

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں بے شمار یورپی باشندے حصول علم کے لیے اسلامی مراکز میں آئے۔ جن میں فیبو ناشی، اڈیلارڈ آف باتھ اور قسطنطین افریقہ[۱] جیسے اہل علم شامل تھے۔ ان طلبہ نے طب (medicine)، فلسفہ (philosophy)، ریاضی (mathematics)، تکوین نگاری (Cosmography) اور دیگر علوم وفنون سیکھے اور پڑھے۔ عربوں نے بیت الحکمت (House of Wisdom) میں متعدد یونانی کتب کے تراجم کئے اور انہیں ترقی بھی دی۔ پھر عہد متوسط میں ان علوم کا ازسرنو یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

ان یونانی کتب کے لاطینی تراجم متعدد مقامات پر کیے گئے۔ طلیطلہ (Toledo)، سپین (Spain) اور سسلی (Sicily) یورپ کو ترسیل علم کے اہم ترین مقامات بنے۔ برگنڈو پی سا[۲] نے ارسطو کے متعدد مضامین ترکی میں شام کی سرحد کے قریب مقام انطاکیہ (Antioch) سے دریافت کیے اور ان کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ سٹیفن آف پائزے[۳] نے لگ بھگ 1127ء میں عربی کے 'مینوئل آف میڈیکل تھیوری' کا (Arab manual of medical theory) لاطینی زبان میں ترجمہ کیا تھا[۴]۔

گیراڈ آف کریمونا نے ذاتی طور پر عربی زبان کی ۸۷ کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا جن میں الماجسٹ (Al-magest) بھی شامل تھی۔ الخوارزمی کی کتاب 'الجبرا والمقابلہ'، جابر بن

---

[۱] Constantine the African: قسطنطین افریقہ (گیارہویں صدی عیسوی) ایک ماہر طبیب تھا۔

[۲] Burgundio of Pisa: برگنڈو پی سا (بارہویں صدی عیسوی) ایک مشہور اطالوی قانون دان تھا۔

[۳] Stephen of Pisa or Stephen the philosopher or Stephen of Antioch: سٹیفن آف پائزے (بارہویں صدی عیسوی) ایک اطالوی مترجم تھا جس نے عربی زبان کی سائنس کی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

[۴] Wikipedia: Islamic contributions to Medieval Europe

سنان البتانی کی کتاب 'Elementa Astronomica'، الکندی[۱] کی تصنیف 'On Optics'، احمد بن محمد بن کثیر الفرغانی[۲] کی کتاب 'On Elements of Astronomy and the Celestial Motions'، فارابی کی کتاب 'On the Classification of Sciences'، الرازی کی 'The Chemical and Medical Works'، ثابت ابن قرا، حنین بن اسحاق، ابراہیم الزرقالی[۳]، جابر بن الفلاح[۴]، بنو موسیٰ، ابو کامل الحاسب، الزہراوی اور ابن الہیثم کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ جابر بن حیان کی کتاب 'الکیمیا' کا ترجمہ رابرٹ آف چیسٹر نے 1144ء میں کیا تھا۔ Book of Seventy کا ترجمہ گیراڈ آف کریمونا نے کیا تھا۔ الکیمیکل ورکس آف محمد ابن زکریا رازی کا لاطینی میں ترجمہ بارہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ کیا گیا تھا۔

الخوارزمی کے ریاضی کی کتب کے تراجم نے یورپ کو بہت متاثر کیا۔ یورپ میں الجبرا کی ابتدائی دور کی کتب میں تسلیم کیا گیا کہ اس براعظم میں الجبرا کی بہت سی اولین کتابیں الخوارزمی کے تراجم اور دیگر اسلامی مصنفین کی کتابیں تھیں۔ 'الگورتھم' (Algorithm) کے الفاظ الخوارزمی کے لاطینی نام الگورزمی (Algorismi) اور لفظ الجبرا کی کتاب کے عنوان 'کتاب الجبر والمقابلہ' سے ماخوذ ہیں۔ یہ الفاظ بھی عربی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اور دیگر عربی فلکیاتی اور ریاضیاتی تصانیف مثلاً البتانی اور محمد بن ابراہیم الفزاری کی کتاب Great Sindhind (جو سریا سدھانتا اور براہم گپتا پر مشتمل ہے) کا بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا[۵]۔

---

[۱] al-Kindus: ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی (801ء-873ء) کا شمار اسلامی دنیا کے اوّلین حکما اور فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے ریاضی، طبیعیات، فلسفہ، ہیئت، موسیقی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم پر اعلیٰ پائے کی کتب تحریر کیں۔

[۲] Alfraganus: ابوالعباس احمد بن محمد بن کثیر افرغانی (805ء-870ء) جو مغرب میں الفرغانی کے نام سے مشہور ہے۔

[۳] Ibrahim al-Zarqali: ابراہیم الزرقالی (1029ء-1087ء) اپنے دور کا سب سے بڑا ماہر فلکیات تھا۔

[۴] Jabir ibn Aflah: جابر بن فلاح (1100ء-1150ء) ایک ماہر فلکیات اور ریاضی دان تھا۔

[۵] The Crest of the Peacock, p. 306

ابن معاد الجیانی[1] کی تصنیف 'The Book of Unknown Arcs of a Sphere' کا یورپی ریاضی پر بہت اثر تھا۔ 'رگیومنتانوس'[2] کی کتاب 'On Triangles' یقیناً بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی کیونکہ اس میں جابر بن الفلاح کی کتاب میں سے لیا گیا مواد شامل ہے۔ اس امر کی نشاندہی سولہویں صدی عیسوی میں جیرولاموکاردانو[3] نے کی ہے[4]۔

ابوالفتح الخازنی کی کتاب 'زج السنجری' (Zij Sanjari) فلکیات پر اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے۔ اس کا تیرہویں صدی عیسوی میں گریگوری کونیڈیز[5] نے یونانی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ بازنطینی سلطنت میں اس کا بہت شوق سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ بطلیموسی نظام[6] میں بے پناہ ترامیم ہوئیں جو البتانی اور ابن رشد نے کیں۔ ان کے نتیجے میں مؤیدالدین العرضی[7]، الطوسی اور ابن الشاطر[8]

---

۱ Ibn Mu'adh al-Jayyani: ابن معادالجیانی (989ء-1079ء) ایک ماہر ریاضی دان، اسلامی مفکر و عالم اور اندلس کے قاضی تھے۔

۲ Regiomontanus: رگیومنتانوس (1436ء-1476ء) ایک معروف ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔

۳ Gerolamo Cardano: جیرولاموکاردانو (1501ء-1576ء) ایک اطالوی ماہر ریاضی، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، فلکیات، جغرافیہ، جواہرات اور مصنف تھا۔

۴ http://www-history.mcs.st-andrews.ac.uk

۵ Gregory Choniades: گریگوری کونیڈیز (1240ء-1320ء) ایک بازنطینی یونانی ماہر فلکیات تھا جس نے ایران میں قیام کے دوران فارسی زبان، ریاضی اور علم فلکیات سیکھا۔

۶ نظام فلکیات کا ایک ایسا نظریہ جس میں زمین کو کائنات کا مرکز تصور کیا جاتا ہے اور تمام اجرام فلکی اس کے گرد گردش کرتے ہیں، کو بطلیموسی نظام کہتے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کی بنیاد بطلیموس نے ڈالی تھی۔

۷ Mu'ayyad al-Din al-Urdi: مؤیدالدین العرضی (تیرہویں صدی عیسوی) ایک ماہر فلکیات تھے۔

۸ Ibn al-Shatir: الحسن بن علی بن ابراہیم بن محمد بن المطعم (1304ء-1375ء) کو ابن الشاطر کے لقب سے جانا جاتا ہے۔ وہ ماہر ریاضی دان، آلات رصد اور فلکیات کے سائنسدان تھے۔

بطلیموسی نظام سے منفرد نظام مرتب کیے جن کو بعدازاں کا پرنیکس نظام[۱] میں ضم کر دیا گیا۔
ابن سینا کی القانون فی الطب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے پورے یورپ شائع کیا گیا۔ یورپ میں سولہویں صدی عیسوی تک یہ کتاب طب کی نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی۔ یورپ میں اسے پینتیس (35) سے زائد بار چھاپا گیا۔ الرازی نے Comprehensive Book of Medicine (جامع الکتاب الادویہ) لکھی جس میں خسرہ (measles) اور چیچک (small pox) کی محتاط انداز میں تفصیل بیان کر کے ان کے درمیان فرق واضح کیا۔ یہ کتاب بھی یورپ میں بہت مقبول ہوئی۔ الزہراوی نے کتاب التصریف لکھی جو علم الجراحت (سرجری) کا انسائیکلوپیڈیا تھی۔ اس کا لاطینی میں ترجمہ 1100ء میں غالباً گیراڈ آف کریمونا نے کیا۔ یہ کتاب صدیوں تک یورپی میڈیکل سکولوں میں پڑھائی جاتی رہی[۲]۔
ابوالہیثم نے کتاب المناظر (Book on Optics) لکھی جس میں اس نے بصارت اور نور کے بارے میں ایک نظریہ وضع کیا۔ اس کے لاطینی ترجمے نے بہت سے متاخر یورپی سائنسدانوں کی تصانیف کو متاثر کیا جن میں راجر بیکن اور جان کیپلر بھی شامل تھے[۳]۔
مسلمانوں نے یورپ کو براستہ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ بہت سے پھلوں اور سبزیوں سے متعارف کرایا اور بعض دور دراز چین اور ہندوستان سے لائی ہوئی اشیا سے بھی انہیں آشنا کرایا جن میں خرشوف (Artichoke)، پالک اور بینگن شامل تھے۔
پارچہ بافی کے نئے انداز اور نیا مواد بھی متعارف کرایا گیا جن میں مخمل، ریشمی کپڑا اور ساٹن شامل تھی۔ اسی طرح اسلامی فنونِ زیبائش اور دیگر نہایت بیش قیمت اشیا پورے عہد متوسط میں یورپ

[۱] Copernican heliocentrism: کاپرنیکس نظام فلکی، عظیم ماہر فلکیات کاپرنیکس کے نظریات پر مشتمل ہے۔ کاپرنیکس کے اس نظام کے مطابق کائنات کا مرکز زمین کی بجائے سورج ہے اور بشمول زمین دیگر اجرام فلکی اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔

[۲] Arabian Medicine, p. 87

[۳] https://www.jstor.org

کو پہنچائی جاتی رہیں۔

اسلامی ظروف سازی یعنی روزمرہ کے استعمال کے برتن اپنے معیار کے لحاظ سے اتنے اچھے ہیں کہ انہیں اب بھی یورپین برتنوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے قالین، خواہ وہ سلطنت عثمانیہ، مشرقی بحیرۂ روم یا مصر کی مملوک ریاست مصر یا شمالی افریقہ میں بنتے تھے یورپ میں دولت اور فارغ البالی کی نمایاں علامت سمجھے جاتے تھے۔ ایسے قالین، مشرقی عناصر کے یورپی پینٹنگ کے اندر ادغام اور بالخصوص وہ قالین جو مذہبی موضوعات کے مظہر ہیں بہت دلچسپ مثال پیش کرتے ہیں۔

یورپی موسیقی میں استعمال ہونے والے متعدد جدید آلات موسیقی عرب کے آلات سے متاثر ہیں جن میں 'ریبک' (rebec) (تین تارا، وائلن کی جدّ) جو رباب (rebab) سے ماخوذ ہے۔ قطارہ (qitara) سے گٹار (guitar)، نقارہ (naqareh) سے 'نیکر' (naker) بنا۔ شاہم (shawm) اور گلزینا (Gulzaina) جو نرسل سے بننے والا 'ضمر' (zamr) اور 'الزرنا' (al-zurna) ہے، شامل ہیں[1]۔

یورپی عہد متوسط کی ٹیکنالوجی نے اسلامی دنیا کی ٹیکنالوجی کو اختیار کر لیا تھا۔ ان میں مختلف فلکیاتی آلات بھی شامل تھے۔ مثلاً 'یونانی' اصطرلاب (astrolabe) جو دراصل عربوں کا ترقی یافتہ آلہ تھا۔ جسے ایسا نظر فریب بنا دیا گیا تھا کہ یہ 'Quadrans Vetus' کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ ایک 'جامع گھنٹہ نما ربع محیط' (Universal horary quadrant) تھا۔ جسے کسی بھی عرض بلد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح 'سافیہ' (Saphaea) تھی جو ایک ہمہ گیر اصطرلاب (astrolabe) تھی۔ یہ ابراہیم الزرقالی کی ایجاد تھی۔ یہ فلکیاتی آلہ سدس (Sextant) تھا۔ اسی طرح مختلف آلات جراحی (بشمول قدیم اشکال کے ترقی یافتہ اوزار) اور مکمل نئی ایجادات، ترقی

[1] Historical facts for the Arabian Musical Influence, p. 141 - 142

یافتہ گراری دار آبی گھڑیاں اور خودکار آلات شامل تھے[۱]۔

خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی پیچیدہ آبی گھڑیوں اور خودکار آلات نے یورپی ہنرمندوں کو بے حد متاثر کیا۔ جنھوں نے اولین مکینیکل گھڑیاں تیرہویں صدی عیسوی میں بنائے تھے[۲]۔

مشرق وسطیٰ اور مشرقی نصف کرہ سے بڑے پیمانے پر قدیم اشیا اور نئی ٹیکنالوجی کی درآمدکاری نے نشاۃ ثانیہ (renaissance) سے ہمکنار ہونے والے یورپ پر بہت اچھے اثرات مرتب کیے۔ یہ تاریخ عالم میں ٹیکنالوجیز کی سب سے بڑی منتقلیوں میں سے ایک تھی۔

اینڈریو واٹسن کہتا ہے کہ 700ء اور 1100ء کے درمیان ایک زبردست زرعی انقلاب آیا جس نے فصلوں کی بہت بڑی تعداد (اٹھارہ فصلیں) اور ٹیکنالوجیز سپین سے عہد متوسط کے یورپ میں پھیلا دیں۔ مثلاً گنے سے چینی بنانا، آبی گھڑیاں، پھل کا گودا محفوظ کرنا، کاغذسازی، ریشم، فلنگ ملیں، مل ٹیکنالوجی، سکشن پمپ، رہٹ کا پہیہ اور نظام آبپاشی کے لیے چین پمپ وغیرہ۔ زرعی انقلاب کے دوران مسلمانوں کی خدمات نئے آلات کی ایجاد میں کم تھیں بمقابلہ ان کے وسیع پیمانے پر استعمال کے، جو زمانہ قبل از اسلام میں صرف محدود رقبے اور کم پیمانے پر استعمال ہوتے تھے۔ ان دریافتوں نے بڑے صنعتی کام ممکن بنا دیئے جو پہلے انسانی ہاتھوں کی قوت سے یا بوجھ کھینچنے والے جانوروں کی مدد سے کیے جاتے تھے۔ چنانچہ عہد متوسط کے یورپ میں ان میں سے بیشتر کام مشین سے کئے جانے لگے[۳]۔

[۱] Studies in Medieval Islamic Technology, p.23

[۲] History of Project management, p. 5

[۳] https://www.wsfcs.k12.nc.us

میگوئیل آسن پلاسیوس[۱] نے خیال ظاہر کیا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی ادبی تصنیف دانتے[۲] کی Divine Comedy میں 'آخرت' کے بہت سے نمایاں اوصاف اور سلسلۂ واقعات براہِ راست یا بالواسطہ اسلامی عقیدہ معاد پر مبنی عربی تصانیف سے ماخوذ ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سفرمعراج کے بارے میں تصنیف (کتاب المعراج) کا 1264ء میں یا Ladder Liber Scale کی کتاب The Book of Mohammad's Machometi سے پہلے لاطینی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ دانتے یقینی طور پر مسلم فلسفے سے آگاہ تھا۔ اس نے فراموش کردہ غیر مسیحی فلسفیوں کی یونانی اور عظیم لاطینی فلاسفروں کے ہمراہ ایک فہرست مرتب کی ہے۔ اس نے ابن رشد سکول آف فلاسفی (Averroism school of philosophy) کے بانی ابن رشد کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس نے مغربی یورپ میں سیکولر افکار کے عروج میں نمایاں کردار ادا کیا ہے[۳]۔

امام غزالیؒ کا بھی عہد متوسط کے مسیحی فلسفیوں پر بہت گہرا اثر تھا۔ صوفی سکالر مارگریٹ سمتھ[۴] کے مطابق اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام غزالیؒ کی تصانیف ان اولین کتابوں میں سے ہیں جنہوں نے یورپی سکالرز کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ مسیحی مصنفین میں سے سب سے بڑا آدمی جو امام

---

[۱] Miguel Asin Palacios: میگوئیل آسن پلاسیوس (1871ء - 1944ء) ایک نامور ہسپانوی مستشرق، اسلامیات اور عربی زبان کا معلم، کیتھولک پادری تھا جس نے ڈیوائن کامیڈی پر تحقیقی کتاب اسلام اور ڈیوائن کامیڈی لکھ کر شہرت حاصل کی۔

[۲] Durante degli Alighieri: دانتے الیگیری (1265ء-1321ء) اٹلی کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تمثیلی نظم طربیہ خداوندی 'ڈیوائن کامیڈی' میں شاعر کی روح دوزخ اعراف اور جنت کا سفر کرتی ہے۔

[۳] Islam and Divine Comedy, p. 513

[۴] Margaret Smith: مارگریٹ سمتھ (1884ء-1970ء) ایک عیسائی صوفی سکالر تھی۔

غزالیؒ سے متاثر ہوا، وہ سینٹ ٹامس ایکوناس[1] تھا۔ اس نے مسلم مصنفین کے زیر اثر ہونے کا اعتراف کیا۔ دراصل اس نے یونیورسٹی آف نیپلز میں تعلیم حاصل کی تھی جہاں اس وقت اسلامی لٹریچر اور کلچر غالب تھا[2]۔

قرآن کا بہت سا حصہ پرانی قوموں کے عروج وزوال سے متعلق ہے اور تاریخ کو علم کا ایک حصہ مانتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں ہیروڈوٹس[3] کے بعد پہلی بار یعقوبی[4]، طبری[5]، مسعودی[6]، ابن خلدون[7] اور البیرونی جیسے تاریخ دان پیدا ہوئے۔ ابن خلدون پہلا مسلمان تاریخ دان تھا جس نے فلسفہ تاریخ کے اصول وضع کیے اور تاریخ پر تنقید کے اصول متعارف کرائے۔

ابن خلدون نے اپنی کتاب (مقدمہ) میں تاریخ انسانی میں پہلی بار ارتقائے تاریخ کے اصولوں کی توضیح وتشریح کی اور انہیں غور وخوض کے لیے پیش کیا۔ اس نے تاریخ پر موسم، ماحول، اخلاقیات اور روحانیت کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا اور قوموں کے عروج وزوال کے اصول بھی واضح کیے۔ اس لیے بجا طور پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جدید تاریخ اور عمرانیات کی

---

[1] Thomas Aquinas: ٹامس ایکوناس (1225ء-1274ء) ایک مسیحی فلسفی اور عالم دین تھا۔ اس نے اپنے وقت کے بہترین استادوں سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی اور شہنشاہ فریڈرک دوئم کا درباری بن گیا۔ لیکن 1243ء میں اس نے درویشی اختیار کر لی۔ اس نے اپنی مذہبی فلسفیانہ تصانیف میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فطرت پرستی اور عقل پرستی کو مسیحی عقائد سے بہ آسانی ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

[2] Al-Ghazali, p. 105 - 132.

[3] Herodotus: ہیروڈوٹس (425BC-481BC) ایک قدیم یونانی مؤرخ تھا جسے ابوالتاریخ کہا جاتا ہے۔

[4] احمد ابن ابو یعقوب ابن جعفر ابن وہب ابن ودیع الیعقوبی المعروف یعقوبی (متوفی 897ء) ایک مسلمان جغرافیہ دان اور مسلم دنیا کے قرون وسطیٰ کے پہلے مورخ تھے۔ تاریخ یعقوبی اسلامی تاریخ پر ان کی مشہور ترین کتاب ہے۔

[5] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (838ء-923ء) مشہور مسلم مفسر اور مورخ تھے۔

[6] ابوالحسن علی بن حسین بن علی مسعودی (896ء-956ء) مشہور مسلم مؤرخ، جغرافیہ دان اور سیاح تھے۔

[7] علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (1332ء-1406ء) ایک مورخ، فقیہ، فلسفی اور کامیاب سیاستدان تھے۔ انہیں فلسفہ، تاریخ اور عمرانیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ مقدمہ فی التاریخ (مقدمہ ابن خلدون) ہے۔

بنیادیں رکھیں۔ ٹائن بی کے بقول اس کا 'مقدمہ' اپنی نوعیت کا عظیم ترین کارنامہ ہے جسے کسی ذہن نے کسی زمان و مکان میں تخلیق کیا ہو[۱]۔

مسلمانوں کا مغرب پر سب سے بڑا احسان سائنسی اور استخراجی (inductive) طریقہ تحقیق ہے۔ رابرٹ بریفالٹ نے لکھا ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی اور راجر بیکن بنیادی طور پر عربوں کے علم کے زیر اثر آگے بڑھے[۲]۔

مغرب میں پندرہویں صدی عیسوی تک سائنس اور فلسفہ کی تعلیمات کو مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ارسطو اور ابن سینا کی تعلیمات یہاں ممنوع تھیں۔ برونو[۳] کو جلا دیا گیا۔ کیپلر کو سزا دی گئی۔ گیلیلیو کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نظریات سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔ اس کے برعکس مسلمان معاشرے میں سائنس اور مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی گئی۔ جس کے سبب یہاں سائنس اور فلسفہ نے ترقی پائی اور پھر مغرب نے بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

مغربی دانشور عام طور پر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب اسلامی تصوف سے بہت متاثر ہوا ہے۔ گوئٹے[۴] پر ایران کی صوفیانہ شاعری کا بہت گہرا اثر ہے۔ اسی طرح دانتے کی Divine Comedy پر ابن عربیؒ[۵] کا اثر ہے[۶]۔

---

۱ A Study of History

۲ Making of Humanity, p.200

۳ Giordano Bruno: گیوردانو برونو (1548ء-1600ء) ایک اطالوی فلسفی اور ریاضی دان تھا جو اپنی جوانی میں راہب تھا لیکن روشن خیالی کے باعث کلیسا نے اس پر کفر کا الزام لگایا اور اسی جرم کی پاداش میں اسے زندہ جلا دیا گیا۔

۴ Johann Wolfgang von Goethe: گوئٹے (1749ء-1832ء) ایک جرمن ادیب تھا جو شاعری، ڈراما، ادب، فلسفہ، الٰہیات، غرض بے شمار اصناف میں لکھتا رہا۔

۵ شیخ اکبر محی الدین محمد بن العربی الحاتمی الطائی الاندلسیؒ (1165ء-1240ء) دنیائے اسلام کے ممتاز صوفی، عارف، محقق اور علوم کا بحر بیکنار رہیں۔ اسلامی تصوف میں آپؒ کو شیخ اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپؒ کی تصانیف میں فصوص الحکم اور الفتوحات مکیہ بہت مشہور ہے۔

۶ A History of Muslim Philosophy, vol. 2, p.1338 - 40

مختصراً یہ کہ مسلمانوں کی ذہنی اور تعلیمی کامیابیوں کا مغربی ذہن پر گہرا اثر تھا۔ مسلم دنیا سے منتقل ہونے والے علم نے مغرب پر گہرے اثرات مرتب کیے مثال کے طور پر:

(i) اس سے انسان دوستی کی تحریک (Humanistic Movement) شروع ہوئی۔

(ii) تاریخی علوم (Historical Sciences) شروع ہوئے۔

(iii) سائنسی تجربہ و مشاہدہ شروع ہوا۔

(iv) فلسفہ اور عقیدہ میں باہمی تفہیم پیدا ہوئی۔

(v) تصوف کی تحریک نے جنم لیا۔

(vi) کانٹ تک مغرب اسلامی فکر سے متاثر رہا وغیرہ۔

اس لیے حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے صحیح فرمایا ہے:

عہد نو با جلوہ ہا آراستہ
از غبار پائے ما برخاستہ[1]
(یہ جدید تہذیب جو حُسن اور شان و شوکت سے آراستہ ہے)
(ہمارے قدموں سے اٹھنے والی خاک سے نکلی ہے)

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مغربی دنیا پر ہمارا اثر صفر ہے اور ہم پر مغربی فکر کا اثر نہایت گہرا ہے۔ ہم ان کی زبان بولتے ہیں۔ ان کے زاویہ نگاہ میں بات کرتے ہیں۔ ان کے فکری و عملی ایجنڈا کو آگے بڑھاتے ہیں اور عام طور پر ان کو حق و باطل اور خیر و شر کا معیار سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو مسلمان معاشروں کی اصلاح و ترقی چاہتے ہیں وہ بھی مغربی فکر کے غلبے کے اسباب سے واقف نہیں ہیں اور سادہ لفظوں میں عقل کا مقابلہ غصے سے کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] اسرار خودی: وقت سیف

4

جدید علوم کا ارتقا

قرونِ اولیٰ کے مسلمان بڑی کامیابی سے اپنے وقت کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہوئے اور انہوں نے انسانی فکر و عمل کی سرحدوں کو آگے دھکیل کر دم لیا۔ وہ بڑا عرصہ مہذب دنیا پر چھائے رہے اور ذہنی ارتقاء کے تقریباً سب شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کرنے لگے۔ لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ انحطاط پذیر ہوتے چلے گئے اور بالآخر گہری نیند میں ڈوب گئے۔ جب وہ اپنے زمانے کے چیلنجوں سے مقابلے کی صلاحیت سے محروم ہوئے تو مغرب اور بالخصوص یورپ نے ان کے ذہنی اور سائنسی ورثے سے خوب فائدہ اٹھایا اور ان کی دریافتوں کو مزید آگے بڑھانے لگے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مسلمانوں نے یونانی علم میں مہارت حاصل کر کے اسے مزید آگے بڑھایا تھا۔ آیئے اس امر کی تحقیق کریں کہ عہد متوسط اور جدید دور میں مغرب میں کیا بنیادی علمی و فکری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں:

1 سائنس کا ظہور

جدید مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ عالمی نقطۂ نظر سے سائنسی انقلاب ایک انقلابی تبدیلی تھی۔ 1611ء میں انگریز شاعر جان ڈون[1] نے لکھا:

The new Philosophy calls all in doubt,

The Element of fire is quite put out;

The Sun is lost, and th'earth, and no man's wit

Can well direct him where to look for it. [2]

(فلسفہ نو شبہے کی طرف ہے بلاتا)
(شعلہ آتش ہو چکا ہے ٹھنڈا)

---

[1] John Donne: جان ڈون (1572ء-1631ء) ایک برطانوی شاعر اور گرجا کا کلرک تھا۔

[2] An Anatomy of the World

(آفتاب ہو گیا ہے کہیں گُم)
(عقل حیراں ہے کہاں سے اسے لائیں)

سائنسی انقلاب سے جدید سائنس کا ظہور ہوا۔ جب ریاضی (Mathematics)، فزکس (Physics)، فلکیات (Astronomy)، حیاتیات (Biology) اور کیمیا (Chemistry) میں ہونے والی پیش قدمی نے انسان، معاشرے اور فطرت کے بارے میں پہلے مرّوج نظریات تبدیل کر دیئے۔ یورپ میں سائنسی انقلاب، نشاۃٔ ثانیہ[1] (Renaissance) کے اواخر میں آیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہا۔ اس نے ذہنی اور معاشرتی تحریک کو متاثر کیا جسے روشن خیالی (Enlightenment) کہا جاتا ہے۔ 1543ء میں کاپرنیکس کی 'De Revolutionibus Orbium Coelestium' (On the Revolutions of Heavenly Spheres) شائع ہوئی تو اسے عام طور پر سائنسی انقلاب کا آغاز کہا گیا۔ سائنسی انقلاب کا پہلا مرحلہ گیلیلیو کی کتاب 'Dialogue Concerning the Two Chief World Systems' کی اشاعت سے مکمل ہوا۔ نیوٹن[2] کی کتاب Principia[3] کی اشاعت کو اس انقلاب کی تکمیل سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں قوانین حرکت اور کششِ ثقل (universal gravitation) کے فارمولے بیان کئے گئے ہیں۔

سائنسی انقلاب یونانی علوم پر مبنی تھا جسے رومن/ بازنطینی (Roman/Byzantine) اور عہد

---

[1] Renaissance: نشاۃ ثانیہ قرون وسطیٰ میں یورپ سے اٹھنے والی ایک تحریک تھی جو چودہویں عیسوی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک جاری رہی۔ اس کی ابتدا اٹلی سے ایک ثقافتی تحریک کے طور پر ہوئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے یورپ تک پھیل گئی۔

[2] Sir Isaac Newton: سر آئزک نیوٹن (1673ء-1727ء) ایک مشہور معروف طبیعیات دان، ریاضی دان، ماہر فلکیات، فلسفی اور کیمیا دان تھا جس کا شمار تاریخ کی انتہائی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔

[3] 'پرنسپیا' سر آئزک نیوٹن کی ایک بہت معتبر کتاب ہے جس کا پورا نام 'Mathematical Principles of Natural Philosophy' ہے۔ اس میں نیوٹن کے قوانین حرکت اور قانون کشش بیان کئے گئے ہیں۔

متوسط کے اسلامی علوم نے مزید ترقی ونفاست سے ہمکنار کیا۔اس کا بطور انقلاب اس لیے حوالہ دیا جاتا ہے کہ اس عہد کی بصیرتوں اور دریافتوں نے فطرت کی ایک نئی انقلابی سوچ کو ابھارا اور یونانی سوچ کی جگہ لے لی جسے اس سے پہلے غلبہ حاصل رہا تھا۔

سترہویں صدی عیسوی میں 'سائنسی طریق کار' (systematic experimentation) کی واضح تصریح اور اس کا اطلاق ہو رہا تھا اور اس دور کی عالمی سائنسی برادری میں باضابطہ تجربات کی ایک تحقیقی روایت رفتہ رفتہ جگہ بنا رہی تھی۔فطرت کو سمجھنے کے لیے ارسطا طالیسی استخراجی طریق کار (Aristotelian deductive approach) کی جگہ استقرائی طریق کار (inductive approach) کے استعمال کا فلسفہ لے رہا تھا۔جس کے نتیجے میں معلوم حقائق (known facts) کی بہتر تفہیم اور مزید آگے بڑھنے کے نئے امکانات پیدا ہونے لگے۔اس طرح تجربیت (Empiricism)، سائنس کا ایک بہترین جزو بن گئی۔

فرانسس بیکن[۱] نے جسے بابائے تجربیت (father of empiricism) کہا جاتا تھا، سائنسی انقلاب کی فلسفیانہ بنیاد وضع کی۔اس نے سائنسی تحقیق کے لیے استقرائی طریق ہائے کار قائم کر کے انہیں مقبولیت عامہ کی راہ پر ڈال دیا۔اسی لیے اسے 'بیکونین طریق کار' (Baconian method) یا صرف 'سائنسی طریقہ' کہا جانے لگا۔وہ تحصیل علم (سماوی اور انسانی) کے طریق کار کی اصلاح کی پُرزور وکالت کرتا تھا جس کا نام اس نے 'Instauration Magna' (عظیم عمل بحالی) رکھا۔اس کی کتاب 'Novum Organum'[۲] 1620ء میں شائع ہوئی۔اس میں اس نے دعویٰ کیا کہ انسان فطرت کا ترجمان اور وزیر ہے۔'علم' اور 'قوت انسانی' ہم معنی ہیں۔

---

[۱] Francis Bacon: فرانسس بیکن (1561ء-1626ء) ایک برطانوی وکیل اور فلسفی تھا۔وہ 1582ء میں بار کا رکن بنا اور 1584 میں رکن پارلیمنٹ منتخب ہوا۔اس کی شہرت کی وجہ اس کی فلسفیانہ اور ادبی تحریریں ہیں۔

[۲] Novum Organum Scientiarum بیکن کے فلسفیانہ نظریات پر مشتمل کتاب ہے جو پہلی دفعہ 1620ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں وہ منطق کی ایک نئی قسم کی تفصیل بتاتا ہے جسے وہ 'قیاس' کے پرانے طریقوں سے برتر سمجھتا ہے اسے اب 'بیکونین طریقہ' کہا جاتا ہے۔

اثرات، آلات اور معاونین (helps) سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کچھ کرتے ہوئے صرف ایک طریقہ 'لاگو' (apply) کرتا ہے، باقی ماندہ کام فطرت کرتی ہے جو اندرونی طور پر کارکردگی دکھاتی ہے۔ فطرت سے صرف اس وقت کام لیا جا سکتا ہے جب اس کے اصول وضوابط کے مطابق کام کیا گیا ہو اور صرف یہی طریقِ کار ہے جس کے ذریعے 'تخلیق پر انسان کی سلطنت' قائم کی جاسکتی ہے۔

ولیم گلبرٹ[۱] اس طریقہ کار (methodology) کے ابتدائی وکیلوں میں سے تھا۔ اس نے مروج ارسطا طالیسی فلسفے اور یورنیورسٹی تدریس کے متکلمانہ طریقے کی پُرزور مخالفت کی۔ اس کی کتاب 'De Magnete' میں جو 1600ء میں چھپی سخت گیرانہ طریقے کی حمایت کی گئی ہے اور استقرائی طریق کے تجربات کی وضاحت کرتے ہوئے مقناطیسیت کے قدیم نظریات کو مسترد کیا گیا ہے۔

گیلیلیو نے واضح طور پر کہا کہ قوانین فطرت ریاضیاتی ہیں۔ اس نے اپنی کتاب 'The Assayer' میں لکھا ہے کہ فلسفہ اس عظیم کتاب میں لکھا گیا ہے جسے ریاضی کی زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے حروف، مثلثیں (triangles)، دائرے (circles) اور دیگر جیومیٹرائی اشکال (geometric figures) ہیں[۲]۔

اس کی کتابیں سائنس کی، فلسفہ اور مذہب دونوں سے بالآخر ہونے والی علیحدگی کی طرف ایک قدم تھیں جو کہ انسانی فکر میں ایک اہم قدم تھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں یورپی سائنسدان زمین کے طبیعیاتی مظہر کی پیمائش کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مقداری (quantative) پیمائشوں کا اطلاق کرنے لگے۔ گیلیلیو نے پرزور طریقے سے یہ موقف اختیار کیا کہ ریاضی نے ایک قسم کا ناگزیر تیقن

---

[۱] William Gilbert: ولیم گلبرٹ (1544ء۔1603ء) ایک انگریز معالج، ماہر طبیعیات اور فلسفی تھا۔

[۲] Renaissance Genius, p. 219.

(necessary certainty) مہیا کیا ہے جس کا خدا کے تیقن سے تقابل کیا جا سکتا ہے۔
سائنسی انقلاب نے سائنسی تفتیش و تحقیق کی ادارہ سازی کی طرف رہنمائی کی جس کے لیے ایسی سوسائٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا جو ان افکار اور تجربات کی نشر و اشاعت کا بندوبست کریں۔ ایسی اولین سوسائٹی، رائل سوسائٹی آف لندن[۱] تھی۔ 'فلاسوفیکل سوسائٹی آف آکسفورڈ' (Philosophical Society of Oxford) کے نام سے ایک گروپ قائم کیا گیا جو چند قواعد کے تحت کام کرتا تھا۔ یہ گروپ 'بوڈلیین' (Bodleian) لائبریری کے تحت ہی تھا۔ 1666ء میں فرینچ اکیڈمی آف سائنسز تشکیل پائی جس کے قواعد 1699ء میں لوئی چودہواں[۲] نے وضع کیے۔ اس کے بعد اس کا نام رائل اکیڈمی آف سائنس (Royal Academy of Sciences) رکھ دیا گیا۔ سوسائٹی نے اپنی مطبوعات 'فلاسوفیکل ٹرانزیکشنز' (Philosophical Transactions) کا آغاز 1665ء سے کیا۔ اس طرح اسے دنیا کا قدیم ترین اور طویل ترین سائنسی رسالہ بننے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ یہ پہلا رسالہ تھا جس نے 'ماہرانہ نظرِ ثانی' (peer review) کی روایت قائم کی۔
چند نئے نظریات نے جن میں سے کچھ اپنے اپنے شعبوں میں انقلابی نوعیت کے تھے، سائنسی انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تقریباً پانچ ہزار برسوں سے زمین کا 'ارض مرکز' (geocentric model) ماڈل بطور مرکز کائنات مقبول چلا آ رہا تھا جسے تمام سائنسدان مانتے تھے۔ کاپرنیکس کی 1543ء میں لکھی ہوئی کتاب کے 'شمس مرکز تصور' (heliocentric model) کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی کہ سورج مرکز کائنات ہے۔ کیپلر اور

---

[۱] فطری علوم کو فروغ دینے کے لیے صدر کونسل اور فیلوز پر مشتمل یہ سوسائٹی جسے عام طور پر رائل سوسائٹی (Royal Society of London) کہا جاتا ہے ایک علمی انجمن برائے سائنس ہے۔ یہ اب تک وجود میں آنے والی تمام سوسائٹیوں سے قدیم ترین ہے۔ اس کی بنیاد کنگ چارلس دوم نے نومبر 1662ء میں رکھی تھی۔

[۲] Louis XIV: لوئی چودھواں (1638ء-1715ء) فرانس کا بادشاہ تھا جو 1643ء سے لے کر 1715ء تک حکمران رہا۔

گیلیلیو کی دریافتوں نے اس نظریئے کو ثقاہت دے دی۔ کیپلر ایک ماہر فلکیات تھا جس کا نظریہ یہ تھا کہ سورج کے گرد سیارے 'دائروی گردش' (circular orbits) نہیں کرتے بلکہ بیضوی (elliptical) شکل میں گھومتے ہیں۔ اس نے اپنے اس انکشاف کو سیاروی حرکت کے دیگر قوانین کے ساتھ ملا کر نظامِ شمسی کا ایک ماڈل بنایا جو کہ کاپرنیکس کے اصل سسٹم کی ایک اصلاح تھا۔ گیلیلیو کے اہم کارناموں میں اس کی کتاب 'میکانیات' (Mechanics)، دوربین کی مدد سے اس کے مشاہدات اور 'شمس مرکز نظام' (heliocentric system) کے اثبات کے لیے اس کی تحریریں شامل تھیں۔ کیپلر اور گیلیلیو کی دریافتوں کے مجموعے کی بدولت 'شمس مرکز نظام' نے قبولیت عامہ حاصل کر لی۔

نیوٹن کی کتاب 'Principia' نے حرکت اور کششِ ثقل کے قوانین وضع کیے۔ جنھوں نے اگلی تین صدیوں کے لیے طبیعیاتی کائنات (physical universe) سے متعلق سائنسی فکر کو غالب کر دیا۔ نیوٹن نے کیپلر کے قوانین حرکتِ سیارگاں سے اشتقاق اور اپنے ریاضیاتی بیانِ کششِ ثقل سے کائنات کے 'شمس مرکز ماڈل' کے بارے میں آخری شکوک بھی رفع کر دیئے۔ اس کے قوانین حرکت نے میکانیات کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کر دی۔ اس کے 'کشش ثقل کے قانون' (law of universal gravitation) نے ارضی اور سماوی میکانیات کو یکجا کر کے ایک عظیم نظام پیش کر دیا جس کی بدولت وہ پوری دنیا کو ایک ریاضیاتی فارمولے میں بیان کرنے کے قابل ہو گیا۔ 'پرنسپیا' (Principia) میں نیوٹن نے نظریۂ کششِ ثقل (gravitation) اور حرکت کے تین ہمہ گیر قوانین وضع کیے، جنھوں نے صنعتی انقلاب کے دوران کئی پیش قدمیاں کیں۔

یونانی طبیب 'جالینوس'[1] یورپی طب پر ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک چھایا رہا تاوقتیکہ ایک

[1] Claudius Galenus: جالینوس (129ء-216ء) ایک یونانی طبیب اور فلسفی تھا۔ اس نے تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف طب، منطق، صرف ونحو، اخلاقیات، فلسفہ اور ادب پر لکھیں۔

اطالوی طبیب آندریاس وزالیوس[1] نے تجربات پیش کرکے 'جالینوسی ماڈل' (Galenic model) کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ اس کی کتاب 'De humani corpris fabrica'، علم تشریح الاعضا برائے انسان کے بارے میں بہت معتبر تصنیف ہے۔ ایسی ہی ایک معتبر کتاب ولیم ہاروے نے لکھی جو 1628ء میں 'De Motu Cordis' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ہاروے نے انسانی دل کی ساخت کا تجزیہ کرکے شریانوں کا ایسا نظام پیش کیا اور دکھایا کہ ان کی دھڑکن کا انحصار بائیں مجوف حصے (left ventricle) کے سکڑاؤ پر ہوتا ہے جبکہ دائیں مجوف حصے کا سکڑاؤ اپنے خون کے دباؤ کو 'ریوی شریان' (pulmonary artery) میں دھکیل دیتا ہے۔ ہاروے نے مشاہدہ کیا کہ دونوں جوف تقریباً بیک وقت حرکت کرتے ہیں نہ کہ اپنے اپنے طور پر متحرک ہوتے ہیں جیسا کہ اس کے پیشرووں نے سمجھ رکھا تھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کے دوران علم کیمیا، سائنسی فکر کا اہم پہلو بنتا چلا گیا۔ 'جورجیوس اگریکولا'[2] نے خام دھاتوں کے استخراج کے پیچیدہ طریق کار پر روشنی ڈالی۔ اس سلسلے میں ایک ضخیم کتاب 'De re Metallica'، لکھی جو 1556ء میں شائع ہوئی۔ رابرٹ بوائل[3] نے دھاتوں کو مصفا (صاف) کرنے کے جدید ترین طریقوں کی وضاحت کی۔ 'قانون بوائل' بتاتا ہے کہ مطلق دباؤ (absolute pressure) اور گیس کے حجم میں 'برعکس متناسب' (inversely proportional) تعلق ہوتا ہے بشرطیکہ درجہ حرارت بند نظام کے اندر یکساں رہے۔ اس نے 1661ء میں 'The Sceptical Chymist'، لکھی جس میں اس نے بتایا کہ ہر امرِ واقعہ

---

[1] Andreas Vesalius: آندریاس وزالیوس (1514ء۔ 1564ء) ایک ماہر تشریح الابدان اور طبیب تھا۔ اسے جدید علم تشریح الابدان کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[2] Georgius Agricola: جورجیوس اگریکولا (1494ء-1555ء) ایک جرمن سکالر اور سائنسدان تھا جسے علم المعدنیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

[3] Robert William Boyle: رابرٹ بوائل (1627ء-1691ء) ایک برطانوی سائنسدان اور موجد تھا۔ اسے اس کے قانون بوائل کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ رابرٹ بوائل کو جدید کیمیا کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

متحرک ذرات کے باہمی ٹکراؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ذرات (ایٹمز) سالمات (molecules) اور کیمیائی تعامل کے چند قدیم ترین تصورات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ جدید کیمسٹری کی تاریخ کی ابتدا بن گئی۔

بصریات (optics) کے شعبے میں کیپلر نے 1604ء میں 'Astronamiae Pars Optica' (Optical Part of Astronomy) لکھی جس میں اس نے 'کلیہ مربعِ معکوس' (inverse-square law) کی تفصیل بیان کی۔ یہ کلیہ روشنی کی شدت (intensity of light)، مسطح اور کروی شیشوں کے انعکاس (reflection by flat and curved mirrors) اور مہین سوراخ والے کیمروں (pinhole cameras) کے اصولوں کا تعین کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بصریات (optics) کے فلکیاتی مضمرات مثلاً اختلافِ منظر اور اجرام فلکی کی ظاہری ضخامت کا بھی تعین کرتا ہے۔ 'ولبرورداسنلیوس'[1] نے اپنی 1621ء میں لکھی ہوئی کتاب 'Snells law' میں ریاضیاتی قانونِ انعطاف (reflection) ثابت کیا۔ بعدازاں ڈیکارٹ نے قانونِ انعکاس دریافت کیا اور نیوٹن نے روشنی کے انعطاف کی تحقیق کرتے ہوئے ثابت کیا کہ روشنی ذرّات پر مشتمل ہے جو نسبتاً کثیف مادے کی طرف رفتار بڑھاتے ہوئے منعطف ہوتے ہیں۔ مگر اسے 'انکسارِ روشنی' (differaction of light) کی وضاحت کرنے کے لیے ذرات کو لہروں کے ساتھ ملانا پڑا۔

ولیم گلبرٹ نے اپنی کتاب 'De Magnete' میں انکشاف کیا کہ متعدد مادے برقی خصوصیات کے اظہار کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ رابرٹ بوائل نے ولیم گلبرٹ کی بنائی ہوئی اس فہرست میں برقی خصوصیت رکھنے والے کئی اور مادوں کا اضافہ کر دیا۔ 'اوٹو فان گوئرک'[2] نے ایک ابتدائی قسم کا ساکت جنریٹر ایجاد کیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں محققین نے الیکٹروسٹیٹک جنریٹر

---

[1] Willebrord Snellius: ویلبر ودراسنلیوس (1580ء–1626ء) ایک ماہر ریاضی دان اور فلکیات تھا۔

[2] Otto von Guericke: آٹو فان گوئرک (1602ء–1681ء) ایک جرمن سائنسدان، موجد اور سیاست دان تھا۔

(electrostatic generator) کی رگڑ سے بجلی پیدا کرنے کے عملی طریقے وضع کر لیے۔ 1729ء میں سٹیفن گرے[1] نے ثابت کر دکھایا کہ بجلی کو دھاتی تاروں (فلامنٹس) میں سے گزارا جا سکتا ہے۔

اس عہد میں سائنسی تحقیق کے لیے متعدد آلات، پیمائش کے پیمانے اور شمار کنندہ (Stephen Gray) بنائے جا چکے تھے جو علمِ سائنس کی توسیع کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔ جان نیپئر[2] نے 'لوگارتھم' جدول متعارف کروائے اور 'ایڈمنڈ گنٹر'[3] نے اولین 'اینالاگ آلہ' بنایا جو گنتی کرنا آسان بنا دیتا تھا۔ پاسکل نے 1642ء میں مشینی کیلکولیٹر ایجاد کیا۔ 1642ء میں مشینی کیلکولیٹروں کو ترقی دینے کی مہم شروع کی، پہلے یورپ میں اور پھر دنیا بھر میں یہ کام شروع کر دیا۔ لائبنیز[4] مشینی کیلکولیٹروں کے شعبے کے ذہین ترین موجدوں میں سے ایک بن گیا اس نے ثنائی نمبر نظام (binary number system) کو بھی نفاست سے ہمکنار کیا جو عملاً جدید کمپیوٹر سازی کی بنیاد ہے۔

سب سے پہلا ورکنگ سٹیم انجن اس کے موجد 'ٹامس سیوری'[5] نے 1698ء میں پیٹنٹ کرایا اور

---

[1] Stephen Gray: سٹیفن گرے (1666ء-1736ء) ایک انگریز ماہر فلکیات اور برقیات تھا۔

[2] John Napier: جان نیپئر (1550ء-1617ء) ایک ماہر ریاضی دان، طبیعات دان اور ماہر فلکیات تھا۔

[3] Edmund Gunter: ایڈمنڈ گنٹر (1581ء-1626ء) ایک انگریز ماہر ریاضی دان، جغرافیہ دان اور ماہر فلکیات تھا جسے لاگرتھم کا آلہ متعارف کروانے کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

[4] Gottfried Wilhelm Leibniz: گوٹفر یڈ ویلہم لائبنیز (1646ء-1716ء) ایک جرمن ریاضی دان اور فلسفی تھا۔ تاریخ ریاضی اور تاریخ فلسفہ میں اس کا ایک نمایاں مقام ہے۔

[5] Thomas Savery: ٹامس سیوری (1650ء-1715ء) ایک انگریز انجنئیر اور مؤجد تھا جس نے سب سے پہلے سٹیم انجن متعارف کروایا۔

دعویٰ کیا کہ یہ کانوں میں پانی باہر پمپ کرسکتا ہے جبکہ ٹامس نیوکامن[۱] نے پانی نکالنے کے لیے اس سے بہتر عملی سٹیم انجن بنایا جس نے بالآخر صنعتی انقلاب کی طرف رہنمائی کی۔ 1778ء میں جیمز واٹ[۲] اور میتھو بولٹن[۳]، نیوکامن کے سٹیم انجن کی کارکردگی بڑھا کر اسے مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ نیا انجن اس سے صرف 20 سے 25 فیصد زیادہ کوئلہ فی 'ہارس پاور' استعمال کرتا تھا۔ ابراہام ڈاربی اول[۴] نے بلاسٹ فرنیس میں اعلیٰ درجے کا لوہا تیار کرنے کا طریقہ متعارف کروایا جس میں نباتاتی یا حیوانی مادوں سے بنے ہوئے 'چارکول' کی بجائے معدنی کوئلے سے آگ لگائی جاتی تھی۔ یہ لوہا بنانے کی طرف ایک بڑا قدم تھا۔ یہ لوہا صنعتی انقلاب کے لیے خام مال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

صنعت کاری نے پارچہ بافی (textile industry) کے شعبے میں انقلاب برپا کر دیا۔ پہلے پہل کپڑا گھروں میں (بطور گھریلو صنعت) بنایا جاتا تھا۔ 1764ء میں 'ہرگریوز'[۵] نے گھومنے والا ایسا پرزہ (spinning jenny) بنایا جس سے ایک آدمی بیک وقت دھاگے کی متعدد

---

[۱] Thomas Newcomen: ٹامس نیوکامن (1664ء-1729ء) ایک انگریز موجد تھا جس نے پہلا عملی سٹیم انجن متعارف کروایا۔

[۲] James Watt: جیمز واٹ (1736ء-1819ء) ایک برطانوی موجد او مکینیکل انجینئر تھا جس نے بھاپ کے انجن کو خاطر خواہ ترقی دی۔

[۳] Matthew Boulton: میتھو بولٹن (1728ء-1809ء) ایک انگریز کارخانہ دار اور جیمز واٹ کا کاروباری شراکت دار تھا۔

[۴] Abraham Darby-I: ابراہیم ڈاربی اول (1678ء-1717ء) ایک انگریز موجد تھا جس نے انتہائی اعلیٰ معیار کا لوہا تیار کرنے کا طریقہ کار متعارف کروایا۔

[۵] James Hargreaves: جیمز ہرگریوز (1720ء-1778ء) ایک برطانوی مصور اور موجد تھا جس نے پہلے پہل گھومنے والا پرزہ (spinny jenny) متعارف کروایا۔

چرخیاں تیار کرنے کے قابل ہو گیا۔ ادھر ہنری بسمر [۱] نے 1850ء کے عشرے میں بڑے پیمانے پر فولاد سازی کے لیے ایک سستا طریق کار وضع کر لیا۔ لوہا اور فولاد، دونوں اس صنعت کو مزید بڑھانے کے لیے بہت اہم عناصر تھے جن سے آلات، اوزار، مشینیں، جہاز، عمارتیں اور بنیادی ڈھانچے بننے لگے۔

سٹیم انجن کی ایجاد سے پہلے خام مال اور تیار شدہ ساز و سامان خشکی پر گدھوں اور گھوڑوں سے کھینچے جانے والی ویگنوں کے ذریعے اِدھر سے اُدھر پہنچایا جاتا تھا اور نہروں اور دریاؤں میں کشتیوں کے ذریعے بھیجا جاتا تھا۔ رابرٹ فلٹن [۲] نے اوّلین تجارتی پیمانے پر کامیاب طور پر بھاپ سے چلنے والی کشتی بنائی اور اس کے بعد بھاپ سے چلنے والے جہاز بنے جو بحر اوقیانوس کے آر پار سامان ڈھونے لگے۔ رچرڈ ٹریویتھک [۳] نے پہلا ریلوے سٹیم 'لوکوموٹیو' (انجن) تیار کیا۔ 1830ء میں لیورپول (Liverpool) اور مانچسٹر (Manchester) ریلوے نے اولین باقاعدہ ٹائم ٹیبل کی حامل پسنجر سروس شروع کی۔ 1850ء میں برطانیہ کے پاس 6000 میل سے زیادہ طویل ریل روڈ ٹریک تھا جبکہ 1820ء کے لگ بھگ جان میک ایڈم [۴] نے سڑکوں کی تعمیر کا نیا طریق کار وضع کر لیا تھا اس طرح کچے اور کیچڑ والے راستوں کی بجائے ہموار پختہ اور زیادہ دیرپا سڑکیں وجود میں آ گئیں۔

---

[۱] Henry Bessemer: ہنری بسمر (1813ء-1898ء) ایک انگریز مؤجد تھا جس نے اعلیٰ معیار کا سٹیل تیار کرنے کا طریقہ کار متعارف کروایا۔

[۲] Robert Fulton: رابرٹ فلٹن (1765ء-1815ء) ایک امریکی انجنیئر اور مؤجد تھا جس نے پہلی دفعہ بھاپ سے چلنے والی کشتی متعارف کروائی۔

[۳] Richard Trevithick: رچرڈ ٹریویتھک (1771ء-1833ء) ایک برطانوی مؤجد اور کان کن انجنیئر تھا۔

[۴] John Loudon McAdam: جان لودون میک آدم (1756ء-1836ء) ایک سکاٹش انجنیئر اور روڈ بلڈر تھا جس نے سڑکیں تعمیر کرنے کا انتہائی مؤثر طریقہ macadamisation متعارف کروایا۔

1837ء میں ولیم کک[۱] اور چارلس ویٹ سٹون[۲] نے پہلی تجارتی برقی ٹیلی گراف پیٹنٹ کرائی اور 1866ء میں بحراوقیانوس کے آر پار ٹیلی گراف کیبل بچھادی گئی۔ صنعتی انقلاب کی بدولت بینکوں اور صنعتی فنانسروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا اور فیکٹری سسٹم بھی وجود میں آ گیا۔ جن کا دارومدار مالکان اور منتظمین پر تھا۔ 1770ء کے عشرے میں ایڈم سمتھ[۳] نے 'ویلتھ آف نیشنز' (Wealth of Nations) شائع کردی جس نے آزاد تجارت، ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت اور سرکاری مداخلت سے آزادی پر مبنی اقتصادی نظام کو فروغ دیا۔ صنعت کاری کا عمل وسیع سے وسیع تر ہونے لگا جو برطانیہ سے لے کر یورپ تک، بشمول بلجیئم، فرانس، جرمنی اور امریکہ تک پھیل گیا۔

سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ایک نیا علم طبیعیات ظہور پذیر ہوا۔ نیوٹن نے طبیعات کے پرانے تصورات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا اور حرکت کے قوانین دریافت کر کے سائنسی انقلاب کی بنیادیں ڈال لیں۔ کاپرنیکس اور گیلیلیو نے نظام شمسی اور حرکتِ سیارگاں کے پرانے تصورات تبدیل کر دیئے۔ انجن کی ایجاد نے انسان کی زندگی کو آشنائے انقلاب کر دیا۔ پرنٹنگ پریس نے عوام کے لیے علم بآسانی دستیاب کر دیا۔ پنسلین (Penicillin) جیسی دواؤں نے زندگی اور

---

[۱] William Fothergill Cooke: ولیم فوتھرجل کک (1806ء-1879ء) ایک انگریز موجد تھا جو برقی ٹیلی گراف کا شریک موجد تھا۔ اس نے بطور شراکت دار John Lewis Ricardo کے ساتھ دنیا کی پہلی عوامی برقی ٹیلی گراف کمپنی کی بنیاد رکھی۔

[۲] Charles Wheatstone: چارلس ویٹ سٹون (1802ء-1875ء) ایک انگریز سائنسدان اور موجد تھا جو برقی ٹیلی گراف کا William Fothergill Cooke کے ساتھ شریک موجد تھا۔

[۳] Adam Smith: آدم سمتھ (1723ء-1790ء) ایک برطانوی ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔ اس کی وجہ شہرت اس کی کتاب The Wealth of Nations ہے۔ سمتھ نے سونے چاندی کی بجائے تعلیم یافتہ، ہنرمند اور محنتی افراد کو کسی ملک کی اصل دولت قرار دیا۔

موت کے درمیان فاصلہ وسیع تر کر دیا۔ فن حرب (جنگی اسلحہ) میں 'الفریڈ نوبیل'[۱] کے ایجاد کردہ دھماکہ خیز ہتھیاروں نے تلواروں اور نیزوں کی جگہ لے لی۔ سائنسدانوں نے ذرّے (ایٹم) کا دل چیر کر نیوکلیئر (nuclear) اور تھرمو نیوکلیئر انرجی (thermonuclear energy) کو بندھن سے آزاد کر دیا۔ بڑے بڑے بحری جہازوں نے چھوٹی بادبانی کشتیوں کی جگہ لے لی اور پھر ہوائی جہاز وجود میں آ گئے۔ چند روز پہلے زمین سے پانچ کروڑ پچاس لاکھ میل دور مریخ (Mars) پر انسانی مشین اتر کر نئے فوٹو بھیج رہی ہے۔

عراق اور افغانستان کی جنگوں کو لے لیجئے۔ جن طیاروں نے 'تورا بورا'[۲] پر بمباری کی انہوں نے امریکہ سے اڑان بھری تھی اور راستے میں کہیں رکے بغیر افغانستان میں تباہی و بربادی پھیلا دی۔ امریکہ میں نصب ٹیلی کمیونیکیشن کے ترقی یافتہ آلات کے ذریعے قندھار میں طالبان کی باہمی گفتگو بہ آسانی سنی جانے لگی۔ عراق جنگ میں امریکیوں نے دریائے فرات اور دریائے دجلہ کے صرف ان ستونوں پر بمباری کی جن پر مواصلاتی تاریں لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے یہ کام ایک ماہر سرجن کی طرح کیا جو مریض کا بڑی احتیاط سے آپریشن کرتا ہے اور غیر ضروری چیر پھاڑ سے گریز کرتا ہے۔ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے کہ وہ طیاروں اور مزائلوں کو تباہ و برباد کر دے اور دشمن کی توپوں میں کیڑے پڑیں اور ان مادی قوانین کو بھول گئے جو اس دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں۔ دراصل ہم ان قوانین کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔

---

[۱] Alfred Bernhard Nobel: الفریڈ نوبل (1833ء–1896ء) سویڈن کا کیمیادان، انجنیئر، فوجی جنگی ساز وسامان تیار اور ڈیزائن کرنے والا اور ڈائنامائیٹ کا موجد تھا۔ نوبل انعام اسی کے نام سے موسوم ہے۔

[۲] مشرقی افغانستان میں موجود پہاڑی سلسلے کو تورا بورا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں موجود غاروں کو طالبان اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ امریکہ نے افغانستان پر حملے کے دوران ان پہاڑوں پر انتہائی خطرناک ہتھیاروں کا استعمال کیا۔

2 نئی جمہوری فکر

عہدِ روشن خیالی[1] کے دوران 'معاہدۂ عمرانی' یا معاہدۂ سیاسی ظہور پذیر ہوا جس میں ماخذ معاشرہ اور فرد پر حاکمیت کے جواز کے بارے میں سوالات ابھرے۔ معاہدۂ عمرانی (social contract) کے علمبرداروں کا نظریہ تھا کہ افراد واضح طور پر یا معنوی طور (tacitly) پر اپنی چند آزادیوں سے رضا مندی سے دستبردار ہو کر حکمران یا مجسٹریٹ کے اختیار کے سامنے سرنگوں ہوئے ہیں یا ایک اکثریت کے فیصلے کے سامنے سرنگوں ہوئے ہیں تاکہ ان کے باقی ماندہ حقوق کو تحفظ حاصل رہے۔ اس لیے فطری اور قانونی حقوق کے درمیان تعلق کا سوال، معاہدۂ عمرانی کے نظریئے کا ایک اہم پہلو ہے۔ اسے مجموعی فلاح کے لیے انفرادی قربانی کا اقرار بھی کہا جاتا ہے۔ نظریۂ معاہدۂ عمرانی کے ماخذ رواقی (Stoic) فلسفے اور رومن اور کلیسا کے قانون میں پائے جاتے ہیں۔ تاہم سترہویں صدی عیسوی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے دوران یہ حکومتوں کے سیاسی جوازوں کے سلسلے میں ایک نمایاں نظریئے کے طور پر اُبھر آیا تھا۔ نظریئے کا آغاز انسان کی اس کیفیت کے جائزے سے ہوتا ہے جس میں کوئی سیاسی نظم نہیں (یعنی وہ حالت فطری پر ہے)۔ اس میں فرد کے کام صرف ان کی ذاتی قوت اور ضمیر کے تابع یا تحت ہوتے ہیں۔ پھر یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک معقول فرد اپنی فطری رضا مندی کا کیوں اظہار کرے گا یا سیاسی نظام کے فوائد کے حصول کے لیے اپنی آزادی سے کیوں دستبردار ہوگا۔

'فرانسسکو سواریز'[2] اور ہوگو گروشئیش کو غالباً معاہدۂ عمرانی کے ابتدائی قائلین میں سے سمجھا گیا

---

[1] Enlightenment: عہد روشن خیالی، یا محض روشن خیال طرز عمل یا عہد معقولیت 1620ء سے لے کر 1780ء تک کے عشرے کو قرار دیا گیا ہے جس میں مغربی یورپ کی ثقافتی اور ذہنی قوتوں نے حاکمانہ رویے کی بجائے معقولیت، تجزیہ اور انفرادیت کے اظہار پر زور دینا شروع کیا۔

[2] Francisco Suarez: فرانسیکو سواریز (1548ء-1617ء) سپین کا ایک فلسفی اور ماہر دینیات تھا۔ اس کا شمار تحریک مکتبہ سلمانکا کی نمایاں شخصیات میں شمار ہوتا تھا۔

ہے۔ اس نے فطری قانون کے بارے میں اپنا نظریہ مطلق العنان بادشاہ کے آسمانی حقوق کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر کوئی فطری طور پر کسی حکومت کی اطاعت سے مبرا ہے اور یہ کہ عوام 'Sui juris' (اپنی ذاتی عملداری) میں ہیں اور بطور بنی نوع انسان حقوق رکھتے ہیں۔

ٹامس ہابز[1] نے اپنی کتاب 'Leviathan' میں کہا کہ حالت فطرت میں افراد کی زندگیاں الگ تھلگ، ناقص، ناگوار، وحشیانہ اور مختصر ہوتی تھیں۔ ان کی ایسی حالت تھی جس میں ذاتی مفاد اور ناپیدگی حقوق و معاہدات کی وجہ سے باہمی روابط یا معاشرت وجود میں آنا ممکن نہیں تھی۔ زندگی نراجیت (anarchic) سے عبارت تھی (بغیر قائد یا تصورِ حاکمیت کے تھی)۔ اس حالت فطرت میں افراد 'غیر سیاسی اور غیر معاشرتی' تھے۔ اس حالت فطرت کے پیچھے پیچھے معاہدۂ عمرانی آ گیا۔ یہ معاہدہ ایک ایسا وقوعہ تھا جس کے دوران افراد اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے اپنے بعض انفرادی حقوق ترک کر دیئے تاکہ دوسرے بھی اپنے ایسے حقوق ترک کر دیں۔ اس کے نتیجے میں ریاست قائم ہو گئی جو ایک مطلق العنان (sovereign entity) وجود رکھتی تھی جس نے سماجی روابط کو باضابطہ بنانے کے لیے قانون تخلیق کرنا تھے۔ اس طرح انسانی زندگی 'سب کی سب کے خلاف جنگ' نہ رہی۔

جان لاک[2] نے اپنے 'دوسرے مقالۂ حکومت' (Second Treatise of Government) میں اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ حالت فطرت میں لوگ لازماً پابند اخلاق ہوں گے۔ اپنی زندگیوں یا املاک کی خاطر ایک دوسرے کو ضرر نہیں پہنچاتے ہوں گے۔ لیکن حکومت کی موجودگی کے بغیر ان کے پاس زخمی کیے جانے، غلامی سے بچنے اور اپنے حقوق کے تحفظ کا کوئی بندوبست

[1] Thomas Hobbes: ٹامس ہابز (1588ء-1679ء) ایک برطانوی فلسفی تھا جس نے سیاسی فلسفے پر اپنے کام کے باعث شہرت پائی تھی۔

[2] John Locke: جان لاک (1632ء- 1704ء) ایک برطانوی فلسفی اور فزیشن تھا۔ وہ روشن خیالی کے ممتاز علمبرداروں میں سے تھا۔ اس نے نظریہ تجربیت پیش کیا۔ اس نظریہ کے مطابق تجربہ ہی تمام عالم اور ادراک کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

نہیں تھا۔ انہیں خوف زدگی کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ جان لاک نے دلیل دی کہ افراد کو ایک ایسی ریاست کی تشکیل پر رضا مند ہونا پڑتا تھا جو ان کی زندگیوں، ان کی آزادی اور وہاں آباد لوگوں کی املاک کے تحفظ کے لیے ایک غیر جانبدار جج مہیا کرتی۔ اس نے مزید کہا کہ حکومت کے وجود کا جواز شہریوں کی طرف سے اس اقدام میں سے نکلتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی دفاع کا حق حکومت کو تفویض کر دیتے ہیں۔ اس کے نظریئے کے مطابق حکومت اپنے اختیارات عوام کی منشا میں سے اخذ کرتی ہے (عوام نے اپنے جو اختیارات حکومت کو تفویض کر دیئے ہوتے ہیں، وہی حکومت کے وجود کا جواز بن جاتے ہیں)۔

ژان ژاک روسو[1] نے اپنی کتاب معاہدۂ عمرانی میں آزادی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آزادی صرف اسی وقت ممکن ہے جب عوام کی براہ راست حکومت ہو۔ وہ پوری قانون سازی کر سکتے ہوں۔ جہاں عوامی حاکمیتِ اعلیٰ نا قابلِ تقسیم اور نا قابلِ منتقلی ہو۔ اس کی اشتمالیت (collectivism) اس کے بصیرت افروز تصورِ منشائے عمومی (General Will) میں بھرپور طور پر واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی شہری مغرور و متکبر بنتے ہوئے اپنے حقیقی مفاد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اسے اس قانون کی اطاعت کا رویہ اپنانا ہوگا جو شہریوں نے بحیثیت قوم اجتماعی طور پر بنایا تھا۔ اس طرح قانون انفرادی آزادی کو محدود نہیں کرتا بلکہ یہ آزادی کا مظہر ہوتا ہے۔

چارلس لوئی ڈی مونٹیسکیو[2] نے اپنی کتاب 'The Spirit of the Laws' میں مقننہ (مجلس

---

[1] Jean-Jacques Rousseau: ژاں ژاک روسو (1712ء-1778ء) انسانی مساوات کا مبلغ اور ایک فلسفی تھا۔ جس کی تحریریں فرانس میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بنیں۔

[2] Charles-Louis de Montesquieu: چارلس لوئی ڈی مونٹیسکیو (1689ء-1755ء) عہد روشن خیالی میں ایک فرانسیسی قانون دان اور سیاسی فلاسفر تھا۔ اسے نظریہ علیحدگی اختیارات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق قانون بنانے والے (مجلس قانون ساز)، قانون پر عمل درآمد کروانے والے (انتظامیہ) اور اس قانون کے مطابق فیصلہ کرنے والے (عدالت) افراد یا ادارے علیحدہ علیحدہ ہونے چاہییں۔

قانون ساز)، انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین تقسیم اختیارات کا نظریہ پیش کیا تا کہ تمام اختیارات ایک ہی بادشاہ یا کسی حکمران کے ہاتھ میں بے جا طور پر مرتکز نہ ہوں۔ اس طرح اس نے تحدید و توازن (checks and balances) کے نظام کی پرزور وکالت کی جس کا دنیا کے متعدد دساتیر میں اہتمام کیا گیا ہے۔

انقلاب فرانس (1789ء-1799ء) نے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا اور ان آزادانہ اور انقلابی نظریات سے سرشار ہو کر ایک جمہوریہ قائم کر دی۔ اس انقلاب کو تاریخ انسانی کے اہم ترین واقعات میں سے شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے جدید تاریخ کے دھارے پر بے پناہ اثرات مرتب کیے تھے۔ انقلاب فرانس نے جاگیردارانہ نظام پر کاری ضرب لگائی جس کی وجہ سے فرد کو آزادی ملی۔ غیر منقولہ جائیداد کی بڑے پیمانے پر تقسیم عمل میں آئی۔ بالائی طبقے میں جنم لینے (اشرافیہ) کی بنا پر ملنے والی مراعات منسوخ ہوئیں اور مساوات عمل میں آ گئی۔ بعد میں چلنے والی تقریباً تمام تحریکیں انقلاب فرانس کو اپنے لیے روشنی کا مینار سمجھتی رہیں۔ اس کے مرکزی نعرے Liberte, Egalite and Fraternite (آزادی، مساوات اور اخوت) جدید تاریخ کے بڑے بڑے بحرانوں کے دوران (ازمنہ وسطیٰ میں بجائے جانے والے) طُرّم (clarion call) کی آواز بن گئے۔ ان سے 1917ء کے انقلابِ روس نے بھی جوش اور ولولہ حاصل کیا۔ عالمی سطح پر انقلاب فرانس نے جمہوری مملکتوں کے ظہور کی رفتار تیز تر کر دی۔ یہ تمام جدید سیاسی نظریات کے ارتقاء کے لیے نقطۂ ماسکہ (focal point) بن گیا۔ جس نے دیگر نظریات کے علاوہ لوگوں کو کشادہ دلی (Liberalism)، انقلابیت (Radicalism)، قومیت (Nationalism)، اشتراکیت (Socialism)، مساواتِ زن و مرد (Feminism) اور مذہب و ریاست کی علیحدگی (Secularism) کی اشاعت و تبلیغ کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اس انقلاب سے متعلقہ دستاویزات میں 'اعلانِ حقوقِ انسان' (Declaration of the Rights of Man) کی دستاویز بھی نہایت اہم ثابت ہوئی جس نے حقوق انسانیت کے میدان کو وسیع تر

کر کے اس میں عورتوں اور غلاموں کو بھی شامل کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اگلی صدی میں 'انسدادیت' (Abolitionism) اور عالمگیر حق رائے دہی (universal suffrage) کی تحریکوں کو زبردست تقویت ملی۔

اس ذہنی پس منظر نے آزاد خیالی پر مبنی جمہوریت (liberal democracy)، دستوریت (constitutionalism) اور قانون کی حکمرانی کے تصورات کی طرف رہنمائی کی۔ لبرل ڈیموکریسی ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ایک نمائندہ حکومت لبرل ازم کے ایسے اصولوں کے تحت کام کرتی ہے جن میں مختلف اور قابل شناخت سیاسی پارٹیوں کے مابین منصفانہ، آزادانہ اور مبنی بر مقابلہ انتخابات (الیکشن) ہوں۔ حکومت کے مختلف شعبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم ہو۔ روزمرہ کی زندگی میں ایک کھلے معاشرے کے طور پر قانون کی حکمرانی ہو۔ انسانی حقوق کا مساویانہ تحفظ ہو۔ سب کے لیے شہری حقوق، شہری آزادیاں اور سیاسی آزادیاں ہوں۔ آزادی پسند جمہوریتیں اختیارات حکومت کے تعین کے لیے دستور پر انحصار کرتیں اور معاہدہ عمرانی کے تقدس کو ملحوظ رکھتی ہیں۔ آزاد خیالی پر مبنی جمہوریت بیسویں صدی عیسوی کے دوران مسلسل نشوونما پاتی رہی۔ اس طرح دنیا کا ایک غالب سیاسی نظام بن گئی۔

قانون کی حکمرانی ایک اصول ہے۔ قوم کو اس اصول کی اطاعت کرنی چاہیے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ قوم سرکاری حکام کے من پسند فیصلوں کی اطاعت کرنا شروع کر دے۔ یہ اصول ابتداء میں معاشرے کے اندر قانون کو 'حاکمِ مجاز' (authority) ماننے کا ایک حوالہ دیتا ہے۔ یہ خاص طور پر رویئے پر ایک قدغن ہوتا ہے جس میں حکومت کا رویہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس اصطلاح کو البرٹ وین ڈائسی[1] نے مقبولیت عامہ دلوائی تھی اگرچہ اس کا سراغ ارسطو کے افکار میں تلاش کیا جا سکتا ہے جس نے لکھا تھا کہ 'قانون کو حکمران' ہونا چاہیے۔ قانون کی حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ

---

[1] Albert Venn Dicey: البرٹ وین ڈائسی (1835ء-1922ء) ایک برطانوی قانون دان اور دستوری نظریہ ساز تھا۔

ہر شخص بشمول قانون سازی کرنے والوں کے، قانون کا تابع ہے۔

1610ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے دارالعوام (House of Commons) نے شاہِ انگلستان جیمز اول[۱] کو ایک خط بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ ہز میجسٹی (His Majesty) کی رعایا حکمرانی قانون سے رہنمائی پاتی ہے اور وہ اسی کے تابع ہیں جو سربراہ اور ارکان دونوں کو بتاتا ہے کہ کون سا حق ان سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ وہ کسی غیر یقینی یا آمرانہ شکل کی حکومت کے تابع اور اس سے ہدایت و رہنمائی پاتے ہیں۔ 1607ء میں چیف جسٹس سر ایڈورڈ کوک[۲] نے کہا کہ قانون ایک سنہری اصول اور ذریعہ ہے جو رعایا کے مقدمات کے فیصلے صادر کر سکتا ہے اور وہی ہز میجسٹی کو سلامتی اور امن عطا کرتا ہے۔ اس بات پر بادشاہ بہت ناراض ہوا اور بولا پھر اُسے اس قانون کا تابع ہونا چاہیے جس کی توثیق کرنا غداری ہے۔ ایڈورڈ کوک نے ایک سابقہ قانون دان ہنری بریکٹن[۳] کے الفاظ میں کہا:

Quod rex non debed esse sub homine sed sub Deo et lege

(بادشاہ کو کسی انسان کے تابع نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدا اور قانون کا تابع ہونا چاہیے)[۴]۔

اس سیاسی سیاق و سباق میں دستوریت (constitutionalism) کے معنی ایک مجموعۂ

---

[۱] James Charles Stuart: جیمز چارلس سٹوارٹ (1566ء-1625ء) سکاٹ لینڈ، انگلستان اور آئرلینڈ کا بادشاہ تھا۔ وہ جیمز ششم کے لقب سے سکاٹ لینڈ کا بادشاہ جبکہ جیمز اول کے لقب سے انگلستان اور آئرلینڈ کا بادشاہ بھی تھا۔

[۲] Sir Edward Coke: سر ایڈورڈ کوک (1552ء- 1634ء) ایک برطانوی قانون دان اور جج تھا جو بعد ازاں سیاستدان بن گیا۔

[۳] Henry de Bracton: ہنری دی بریکٹن (1210ء-1266ء) ایک انگریز قانون دان تھا۔

[۴] بادشاہ جیمز اول نے ایک تنازعے میں خود کو ایک جج کی حیثیت دے کر زمین کی ملکیت کے دعویداروں کا موقف سنا اور انہیں سزا دی۔ جب کیس چیف جسٹس آف دی کورٹ آف کامن پلیز (Chief Justice of the Court of Common Pleas)، ایڈورڈ کوک (Edward Coke) کے پاس گیا تو اس نے بادشاہ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ مقدمہ صرف وہ سن سکتا ہے جس نے قانون کی تربیت حاصل کی ہو اور وہ خود بھی قانون کی حکمرانی کے تابع ہوں۔

تصورات (complex of ideas)، رجحانات اور طرز ہائے عمل (patterns of behavior) ہے جو اس اصول کا مظہر ہوتا ہے کہ حکومت کا اختیار ایک مجموعۂ بنیادی قوانین سے ماخوذ اور اسی کے اندر محدود ہے۔ ایک سیاسی تنظیم اس حد تک حسب دستور ہے جہاں تک اس کے اندر شہریوں کے مفادات اور ان کی آزادیاں، بشمول اس میں موجود اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لیے اداراتی میکانیاتِ تحفظ اقتدار (Institutional mechanisms of power control) پائی جاتی ہوں[1]۔

اس سیاسی فکر کے ظہور کے نتیجے میں مغرب نے حقوق اللہ، رشتہ داریوں اور مذہبی حکومتوں کے سیاسی ہدایت ناموں کا مکمل طور پر قلع قمع کر کے رکھ دیا اور ان کی جگہ مسلسل انتخابات اور تحدید و توازن کے لیے شعبہ ہائے ریاست کے مابین تقسیم اختیارات، عدلیہ کی آزادی، دستوریت اور قانون کی حکمرانی کے اصولوں پر استوار، نمائندہ جمہوریتیں قائم کر لیں۔ آج کا مغربی سیاسی نظام جمہوریت، عدلیہ کی آزادی، حقوق انسانی کے احترام، فلاحی ریاست اور سیکولرازم کی مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے جہاں اصل میں لوگوں کی اپنی حکومت ہے جس کا مقصد صرف اور صرف اعوام کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشحال بنانا ہے۔

3 معاشرتی علوم کا عروج

معاشرتی علوم، تعلیم و تعلّم کی وہ شاخ ہے جو معاشرے اور معاشرت کے اندر پائے جانے والے افراد کے باہمی تعلقات پر بحث مباحثہ کرتی ہے۔ ان علوم میں زیادہ اہم معاشیات، سیاسیات (Political Science)، جمعیت شناسی (Demography) اور عمرانیات (Sociology) ہیں۔ وسیع مفہوم میں ان میں مطالعۂ انسانیت مثلاً علم البشر، تاریخ اور قانون شامل ہیں۔

جدید معاشرتی علوم کا ماخذ مغربی فلسفے کا مشترک ذخیرہ ہے لیکن یہ یقینی طور پر انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں سائنس کے اثباتی فلسفے کے ساتھ اس بنیاد پر شروع ہوئے کہ معاشرے کا مطالعہ معیار بند

[1] Controlling the State, p. 4

اور معروضی انداز میں ہی کیا جا سکتا ہے جبکہ اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ ابتدائی علمِ معاشرت عہد متوسط کے اسلام (ابن خلدون) کی تصانیف میں پایا جاتا ہے لیکن 'انسان' کا سائنسی تجزیہ زیادہ تر عہدِ روشن خیالی کے بعد ہونا شروع ہوا تھا اور اس پر عہدِ انقلابات کے نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ جدید معاشرتی علوم انسانی رویئے کی بین الکلیاتِ (interdisciplinary) علمی اور تقابلِ علمی (cross-disciplinary) کی تحقیقات کا مجموعہ ہیں۔

نشاۃٔ ثانیہ (Renaissance) کے اوائل (چودھویں صدی عیسوی) میں 'ژان بوریدان'[1] اور نکول ارسمہ[2] نے زر (money) اور مالیات (finance) پر لکھا اور 'سینٹ اینٹونائن آف فلورنس' نے پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں تحقیق کے انہی خطوط کی پیروی کی۔ سترہویں صدی میں ٹامس ہابز نے استدلال پیش کیا کہ مسلمات (axioms) سے استخراجی (deductive) دلائل ایک سائنسی نظام کی تخلیق کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی تصنیف 'Leviathan' ایک سیاسی دولت مشترکہ کی ایک سائنسی توضیح ہے۔ تاہم اٹھارہویں صدی عیسوی تک معاشرتی علوم کو فلسفۂ اخلاق کہا جاتا رہا۔

آگسٹ کومٹے[3] کا استدلال یہ تھا کہ تصورات تین ترقی پذیر منازل میں سے گزرتے ہیں؛ دینیاتی منزل (theological)، فلسفیانہ منزل (philosophical) اور سائنسی منزل۔ اس نے ان منازل کے درمیان فرق و امتیاز کی توضیح یہ کی کہ پہلی منزل کی جڑیں مفروضے (assumption) میں پیوست ہوتی ہیں۔ دوسری منزل تنقیدی سوچ میں ہوتی ہے اور تیسری منزل مثبت مشاہدے (positive observation) کے اندر ہوتی ہے۔ کومٹے نے تجویز پیش

---

[1] Jean Buridan: ژان بوریدان (1295ء-1363ء) ایک فرانسیسی پادری تھا جس نے یورپ میں کوپرنیکن انقلاب کی بنیاد رکھی۔

[2] Nicole Oresme: نکول ارسمہ (1325ء-1382ء) ایک فرانسیسی فلاسفر تھا جس نے بیک وقت اکنامکس، ریاضی، طبعیات، فلکیات، فلسفہ پر متاثر کن کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ ایک بہترین مترجم بھی تھا۔

[3] Auguste Comte: آگسٹ کومٹے (1798ء- 1857ء) ایک فرانسیسی فلسفی تھا جس نے پیراڈوکسی اور مثبتیت کے اصولوں کی بنیاد رکھی۔ اسے جدید معنوں میں سائنس کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے۔

کی کہ معاشرتی برائیوں کی اصلاح 'عمرانیاتی اثباتیت' (sociological positivism) کے ذریعے کی جاسکتی ہے جس کے خدوخال اس نے ' The Course in Positive Philosophy 1842' اور 'A General View of Positivism 1844' میں بیان کر دیئے۔ اس نے پیش گوئی کی کہ 'اثباتیت کی منزل' (positivist stage) قیاسی، دینیاتی اور مافوق الطبیعیاتی (metaphysical) منازل کے بعد فہم انسانی کے ارتقاء کا حتمی عہد (final era) ہوگی۔ سوچ کا یہ انداز جس کو ہنوز بہت سے لوگ ماننے سے انکاری ہیں، ایک خلاصہ بیان کرتا ہے۔ جس نے جدید معاشرتی علوم کو آگے بڑھایا تا کہ اس کے لیے ایک تجرباتی بنیاد (empirical basis) تلاش کی جاسکے[1]۔

کارل مارکس[2] یہ دعویٰ کرنے والے اولین مصنفوں میں سے تھا کہ اس کے طریق ہائے تفتیش تاریخ کے سائنسی نظریئے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چارلس ڈارون اورگریگر مینڈل[3] نے معاشرتی نظریئے کے توضیحی بیانیے کو شدید دھچکا قرار دیا۔ ڈارون کے کام میں اس قسم کی تحقیق کو انسانی تعلقات کی تحقیق کے ساتھ جوڑنے کی پہلی کوشش سگمنڈ فرائڈ[4] نے ذہن کی کارکردگی کے نظریئے میں کی تھی۔ جب کہ ولیم جیمز[5] نے تجرباتی نفسیات پر اپنے کام میں کی تھی۔ آیئے علوم کی بعض شاخوں کی چند مثالوں پر غور کریں:

---

[1] Dictionary of the Social Sciences

[2] Karl Marx: کارل مارکس (1818ء–1883ء) ایک مشہور فلاسفر، ماہر معاشیات، صحافی، سوشیالوجسٹ اور سوشلسٹ انقلابی تھا۔ جس نے Das Kapital اور The Communist Manifesto جیسی شاہکار کتابیں لکھیں۔

[3] Gregor Mendel: گریگور مینڈل (1822ء–1884ء) ایک سائنسدان تھا جسے جینیاتی سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[4] Sigmund Freud: سگمنڈ فرائڈ (1856ء–1939ء) کو جدید نفسیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

[5] William James: ولیم جیمز (1842ء–1910ء) امریکی ماہر نفسیات اور فلاسفر تھا۔

(1) علم البشریات

علم البشر یا 'بشریات' (Anthropology) انسان کے بارے میں ایک 'نظریۂ کلیت' (totality of human) ہے یعنی ہستی انسان کی کلیّت کا علم۔ یہ شاخِ علم معاشرتی علوم، انسانی خصوصیات (humanities) اور انسانی حیاتیات (human biology) کے مختلف پہلوؤں کے انضمام (integration) کا مطالعہ کرتی ہے۔ بشریاتی معاشرتی علوم (anthropological social sciences) اکثر اشاراتی درجے کی تفصیلات تک جا پہنچتے ہیں جبکہ اس کے برعکس کیمیاء (Chemistry) یا طبیعیات (Physics) سے ماخوذ عام قوانین سے انسان کے بارے میں عمومی معلومات حاصل ہوتی ہیں یا وہ زیادہ عمومی اصولوں کے ذریعے انفرادی کیسوں میں وضاحت پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ علم نفسیات کے کئی شعبوں میں ہوتا ہے۔ علم کی یہ شاخ، جدید دنیا میں ایک بڑے شعبۂ مطالعہ کے طور پر ظہور پذیر ہو چکی ہے[1]۔

(2) علم سیاسیات

علم سیاسیات (Political Science) ایک تعلیمی اور تحقیقی شعبۂ علم ہے جو سیاسیات کے نظریہ اور سیاست کے طریق ہائے کار، سیاسی نظاموں اور سیاسی رویوں کی تفصیلات اور تجزیہ کا مطالعہ کرتا ہے۔

سیاسیات کے شعبے اور ذیلی شعبوں میں سیاسی معیشت، سیاسی نظریہ اور فلسفہ، شہریت (civics) اور تقابلی سیاسیات، سیاسی ارتقا، بین الاقوامی تعلقات اور عوامی پالیسی (public policy) شامل ہیں۔ سیاسیات میں بین الاقوامی تعلقات اور بڑی طاقتوں اور سپر طاقتوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ پچھلے ابواب میں مغرب اور مسلم دنیا میں سیاسی فکر کے ارتقا کی تفصیلات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

[1] Journal of the History of Ideas 59 (3), p. 389 - 403

(3) علم نفسیات

نفسیات (Psychology) ایک تعلیمی اور اطلاقی شعبہ ہے جس میں رویوں اور ذہنی طریق ہائے کار کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایسے علم کے انسانی سرگرمیوں کے متعدد دیگر دوائر (spheres) پر بھی اطلاق کا حوالہ دیتی ہے جن میں افراد کی روزمرہ کی زندگی کے مسائل اور ذہنی عوارض کا علاج شامل ہے۔ لفظ سائیکالوجی (نفسیات) قدیم یونانی 'ψυχή, psyche' (سائیکی)۔ روح، ذہن) اور 'logy' (study) سے ماخوذ ہے۔ 1870ء کے عشرے تک نفسیات فلسفے کی ایک شاخ تھی پھر یہ جرمنی اور امریکہ میں ایک مستقل سائنسی شاخ بن گئی۔ اس کا تجرباتی مطالعہ 1879ء میں اس وقت سے شروع ہوا جب 'ویلہم وونٹ'[1] نے اس کی اولین تجربہ گاہ قائم کی جو جرمنی میں صرف نفسیاتی تحقیق کے لیے مخصوص کر دی گئی۔

جدید علم نفسیات 'رینے ڈیکارٹ' اور برطانوی حامی اصولِ تجربی، براعظمی عقلیت پسند اور داعیٔ مکاتب فلسفہ فرانسس بیکن کی تصانیف سے متاثر ہوا۔ اس کے دورِ متاخر کی تجربی نفسیات پر بے پناہ اثرات تھے۔

- جان لاک کے An Essay Concerning Human Understanding, (1689)
- جارج برکلے[2] کے Treatise Concerning the Principles of Human Knowledge, (1710)
- ڈیوڈ ھیوم[3] کے A Treatise of Human Nature (1740)

[1] Wilhelm Wundt: ویلہم وونٹ (1832ء–1920ء) ایک جرمن ڈاکٹر، فلسفی اور پروفیسر تھے جنہیں بجا طور پر جدید علم نفسیات کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

[2] George Berkeley: جارج برکلے (1685ء - 1753ء) ایک آئرش فلاسفر تھا جسے نظریہ عدم مادیت (Immaterialism) کی ترقی کی بنا پر جانا جاتا ہے۔ جس کے مطابق اس دنیا میں کوئی بھی چیز مادی طور پر اپنا وجود نہیں رکھتی بلکہ تمام اشیاء ہمارے ذہنی خیالات ہیں۔

[3] David Hume: ڈیوڈ ھیوم (1711ء–1776ء) ایک سکاٹش فلاسفر، تاریخ دان اور ماہر معاشیات تھا۔

- ڈیوڈ ہرٹلے[۱] کی کتاب Observations on Man (1749)
- جان سٹوارٹ مل[۲] کی A System of Logic (1843)
- بروچ سپینوزا[۳] کی On the Improvement of the Understanding, (1662)
- لائبنیز کی New Essays on Human Understanding, (1765)

علم کی اس شاخ کی پیشرو فاضلانہ کتابیں ہیں۔ ڈنمارک کے فلسفی سورن کیئر کگارڈ[۴] نے بھی اپنی تصانیف:

The Concept of Anxiety (1844)

The Sickness Unto Death (1844)

کے ذریعے انسان شناسی، متعلق وجود اور جدید مکاتبِ نفسیات کو متاثر کیا۔

کانٹ[۵] نے اپنی 'Metaphysical Foundations of Natural Science, (1786)' میں دعویٰ کیا کہ نفسیات شاید ایک باقاعدہ فطری سائنس نہیں بن پائے گی کیونکہ دیگر اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے مشاہدات کا تعین نہیں کیا جا سکتا[۶]۔

---

[۱] David Hartley: ڈیوڈ ہرٹلے (1705ء-1757ء) ایک انگریز فلاسفر اور Associationistschool of psychology کے بانی تھے۔

[۲] John Stuart Mill: جان سٹوارٹ مل (1806ء-1873ء) ایک برطانوی فلسفی تھا جس کے تصورِ آزادی نے 'فرد بمقابلہ لامحدود ریاستی کنٹرول' کا جواز پیش کیا۔

[۳] Baruch Spinoza: بروچ سپینوزا (1632ء-1677ء) ایک ممتاز ولندیزی فلسفی تھا۔

[۴] Soren Aabye Kierkegaard: سورن اے بی کیئر کگارڈر (1813ء- 1855ء) ایک ڈنمارکی فلسفی، شاعر اور مذہبی مصنف تھے۔

[۵] Immanuel Kant: ایمانویل کانٹ (1724ء-1804ء) ایک جرمن فلسفی اور مشہور ترین مفکر تھا۔ کانٹ نے فلسفے کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ وقت کی حاکم قوتوں کے بارے میں سوال پیدا کیے۔ عقل اور آزادی کو اپنی سوچ کا محور قرار دیا۔

[۶] Journal of History of Behavioural Sciences, p. 353- 377.

کانٹ نے انسانی سوچ، احساس، خواہش اور عمل کی تجربی تحقیق کے لیے ایک متبادل تصور پیش کیا۔ اس کی تصنیف 'Anthropology from a Pragmatic Point of View (1798)' متعدد پہلوؤں سے ایک تجربی نفسیات کی طرح لگتی ہے۔ ارنسٹ ہینرخ ویبر[۱] اور گستاف تھیوڈور فیکنر[۲] نے خارجی تہیجات کی طبعی مقداروں اور ان سے واقع ہونے والی شدتوں (intensities) کے درمیان ریاضیاتی کیفیات کو ناپنے کی بھی کوشش کی تھی۔

'فزیالوجی' بشمول 'نیوروفزیالوجی' پیشہ ورانہ مہارت کا علم ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس سے متعلق چند نئی دریافتیں ہوئیں جو چارلس بیل[۳]، فرینکوائیس میجنڈی[۴]، جوہانز ملر[۵]، ایمل

---

[۱] Ernst Heinrich Weber: ارنسٹ ہینرچ ویبر (1795ء-1878ء) ایک جرمن ڈاکٹر تھا جسے تجرباتی نفسیات کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

[۲] Gustav Theodor Fechner: گستاف تھیوڈور فیکنر (1801ء-1835ء) ایک جرمن فلسفی، طبیب اور ماہر تجرباتی نفسیات تھا۔ اس کا شمار تجرباتی نفسیات کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔

[۳] Sir Charles Bell: سر چارلس بیل (1774ء- 1842ء) ایک سکاٹش سرجن، ماہر علم تشریح الابدان (anatomy)، ماہر علم فعلیات (physiologist)، ماہر علم اعصابیات، آرٹسٹ اور فلسفی تھا۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں حسی اعصاب اور حرکی اعصاب کے درمیان فرق دریافت کرنے کی بنا پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔

[۴] Francois Magendie: فرینکوائیس میجنڈی (1783ء-1855ء) ایک فرانسیسی ماہر فزیالوجسٹ تھا جسے تجرباتی فزیالوجی کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

[۵] Johannes Peter Muller: جوہانز پیٹر ملر (1801ء- 1858ء) ایک جرمن فزیالوجسٹ، comparative anatomist، ichthyologist اور Herpetologist تھے۔

ڈوبوائس ریمنڈ[۱]، پائری پال بروکا[۲]، کارل ورنیک[۳]، گستاف فرٹش[۴]، ایڈورڈ ہٹزگ[۵]، ڈیوڈ فیریئر[۶]، ہرمن ہیلمہولٹز[۷] اور ویلہم وونٹ کے زیر اثر ہوئی تھیں۔ آخرالذکر نے اپنی تاریخی کتاب

Grundzuge der physiologischen Psychologie (Principles of Physiological Psychology) 1874

میں لکھی اور 1879ء میں ایک لیبارٹری کی بنیاد بھی رکھی جس کا مقصد 'Original Research in Experimental Psychology' تھا۔

سگمنڈ فرائڈ نے مریضوں کے غیر شعوری اور فرضی عقائد و خواہشات کو بے نقاب کرنے اور خوابوں کی تعبیر کرنے کے طریقے وضع کئے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے مریضوں کے اعصابی نظام میں گڑبڑ اور جذباتی ہیجانات (hysteria) کا اصل سبب یہی ہیں۔ اس نے اس طریق کار کو تحلیل

---

۱ Emil du Bois-Reymond: ایمل ڈوبوائس ریمنڈ (1818ء- 1896ء) ایک جرمن ڈاکٹر اور فزیالوجسٹ تھا جس نے nerve action potential دریافت کیا۔

۲ Pierre Paul Broca: پائری پال بروکا (1824ء-1880ء) ایک فرانسیسی ڈاکٹر، فزیالوجسٹ اور ماہر علم تشریح الابدان (anatomy) تھا۔

۳ Carl Wernicke: کارل ورنیک (1848ء- 1905ء) ایک جرمن ڈاکٹر، ماہر علم تشریح الابدان (anatomy)، ماہر نفسیات اور ماہر اعصابی امراض (neuropathologist) تھا۔

۴ Gustav Theodor Fritsch: گستاف تھیوڈور فرٹش (1838ء- 1927ء) ایک جرمن ماہر علم تشریح الابدان (anatomy)، ماہر عمرانیات، سیاح اور ماہر طبیعات (physiologis) تھا۔

۵ Eduard Hitzig: ایڈورڈ ہٹزگ (1838ء- 1907ء) ایک جرمن ماہر علم اعصابیات (neurologist) ماہر اعصابی نفسیات (Neuropsychiatry) تھا۔

۶ Sir David Ferrier: سر ڈیوڈ فریئر (1843ء- 1928ء) ایک سکاٹش ماہر نفسیات اور ہر علم اعصابیات (neurologist) تھا۔

۷ Hermann Ludwig Ferdinand von Helmholtz: ہرمن لوڈویگ فرڈیننڈ وون ہیلمہولٹز (1821ء-1894ء) ایک جرمن ڈاکٹر اور طبیعیات دان تھا جس نے کئی سائنسی شعبوں میں کام کیا۔

نفسی (psychoanalysis) کا نام دیا۔ اور ایک فرد کے جنسی ارتقاء کے سفر، اس کے خفیہ ایجنڈے، بری خواہشات اور احساساتِ جرم کی نوعیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ چیزیں کسی فرد کی شخصیت اور اس کے رویئے کے بعض پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کارل گستاف یونگ [۱]، فرائڈ کا رفیق کار تھا۔ اس نے بعد میں اسے اس بنا پر چھوڑ دیا کہ وہ جنسیت (sexuality) پر بہت زیادہ زور دیتا تھا۔ اس نے 'لاشعور' (unconscious) کے تصورات پر غور کرنا شروع کیا اور ذہن کے اُن کاموں کی تصریح کی۔ جو 'انا' (Ego) سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہ ہیں: شعورِ ذات (Conscious self)، احساس (Sensation)، قوتِ لامسہ (Feeling)، ذہانت (Intellect) اور وجدان (Intuition)۔ یونگ ایک تجربی نفسیات پر اصرار کرتا تھا۔ جس میں نظریات کا حقائق پر مبنی ہونا ضروری تھا نہ کہ نفسیات دان کے مفروضات یا توقعات پر۔

ولیم جیمز نے 1875ء میں ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک چھوٹی سی تجرباتی نفسیات کی لیبارٹری قائم کی جبکہ اس نے 1878ء میں ایک کتاب

The Senses and the Brain and their Relations to Thoughts

لکھی جس میں اس نے یہ استدال پیش کیا کہ شعور کوئی ضمنی علامت نہیں بلکہ ایک ارتقائی عمل ہے ورنہ اس نے طبعاً انسانوں کے اندر پیدا ہونے کو منتخب نہیں کرنا تھا۔ اس کی دوسری کتاب

The Varieties of Religious Experiences

بعد میں شائع ہوئی تھی۔ بعدازاں جلد ہی کئی یونیورسٹیوں میں تجرباتی نفسیات (experimental psychology) کی لیبارٹریاں کھل گئیں۔ 1890ء میں ولیم جیمز کی 'The Principles of Psychology' بالآخر شائع ہو گئی۔ جس نے بہت سے ایسے

---

[۱] Carl Gustav Jung: کارل گستاف یونگ (1875ء-1961ء) ایک سوئس ماہر نفسیات تھا جس نے تجزیاتی نفسیات کی بنیاد رکھی۔

سوالوں کے جوابات کی بنیادیں استوار کر دیں جن پر امریکی ماہرین نفسیات نے آنے والے برسوں میں توجہ مرکوز رکھنا تھی۔

جان ڈیوی[۱]، جیمز ہیڈن ٹفٹس[۲]، جارج ہربرٹ میڈ[۳] اور جیمز رولینڈ اینجل[۴] نے علم نفسیات کی تشکیلِ نو کرنا شروع کی۔ جس میں معاشرتی ماحول اور ذہن کی فعالیت اور رویے پر بہت زیادہ توجہ دی گئی جبکہ پہلے 'ونٹ' کی نفسی طبیعیات (psychophysics) سے متاثرہ فعلیاتی نفسیات (psychophysics) پر انحصار کیا جاتا تھا۔ پھر انہوں نے مل کر شکاگو سکول آف سائیکالوجی کی بنیاد رکھی۔ 1892ء میں امریکن سائیکالوجیکل ایسوسی ایشن قائم ہوگئی جس سے ساختیت (Structuralism) اور فعلیت (Functionalism) کی صورت گری ہوئی۔ فرانس میں نفسیات کو بنیادی تقویت علم الامراض ذہنی (Psychopathology) کے شعبے سے ملی جبکہ برطانیہ میں پہلا علمی رسالہ جو نفسیات کے موضوع کے لیے مخصوص کیا گیا اس کی بنیاد 1876ء میں ڈالی گئی۔ اس کا عنوان ذہن (Mind) تھا۔ 'کرداریت' (Behaviourism) بیسویں صدی عیسوی میں نفسیات میں تحقیق کے لیے ایک مائل بہ عروج تجرباتی ماڈل تھا۔ اس کے زیادہ تر اسباب ایسے مشروط نظریات کی تخلیق اور ان کا کامیاب اطلاق تھا جنہیں انسانی رویئے کے لیے سائنسی ماڈل بنایا گیا تھا۔ تاہم نوم چومسکی[۵] کا دعویٰ ہے کہ زبان محض عملی

---

[۱] John Dewey: جان ڈیوی (1859ء–1952ء) ایک امریکی فلسفی، ماہر نفسیات، تعلیمی اور سماجی اصلاح کار تھا۔

[۲] James Hayden Tufts: جیمز ہیڈن ٹفٹس (1862ء – 1942ء) ایک با اثر امریکی فلسفی اور شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر تھا۔

[۳] George Herbert Mead: جارج ہربرٹ میڈ (1863ء–1931ء) ایک امریکی فلسفی، ماہر سماجیات، ماہر نفسیات اور شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر تھا۔

[۴] James Rowland Angell: جیمز رولینڈ اینجل (1869ء–1949ء) ایک امریکی ماہر نفسیات اور استاد تھا۔

[۵] Noam Chomsky: نوم چومسکی (پیدائش 1928ء) ایک یہودی امریکی ماہر لسانیات، فلسفی، مؤرخ، سیاسی مصنف اور لیکچرر رہے۔

مشروطیت (operant conditioning) سے نہیں سیکھی جا سکتی۔ عوام فقروں کی بے شمار اقسام وضع کر سکتے ہیں جن کی اپنی اپنی ساخت اور اپنے اپنے معنی ہو سکتے ہیں اور یہ محض فطری زبان کے تجربے سے پیدا نہیں ہوتے۔ لہٰذا یقیناً کچھ داخلی ذہنی ساختیں اور دماغ کی حالتیں ہوتی ہیں جنہیں 'کرداریت' (Behaviourism) نے خیالی قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔

(4) علم عمرانیات

عمرانیات یا 'سوشیالوجی' (Sociology) معاشرے اور بنی نوع انسان کے طرزِ عمل کا ایک باضابطہ مطالعہ ہے۔ لفظ 'Socio' لاطینی لفظ 'Socius' بمعنی 'ساتھی' یا عمومی طور پر معاشرہ سے لیا گیا ہے اور اس کا لاحقہ 'logy' یونانی ماخذ (Logos) سے ہے جس کے معنی ہیں 'کا مطالعہ'۔
آگسٹ کومٹے کو عموماً بابائے سوشیالوجی سمجھا جاتا ہے تاہم اس شاخِ علم کی باضابطہ تشکیل ایمل دُرکائیم[1] نے کی۔ جس کے لیے اس نے 1887ء میں یونیورسٹی آف بورڈو (University of Bordeaux, France) میں اولین یورپین ڈیپارٹمنٹ آف سوشیالوجی قائم کیا اور قواعدِ عمرانیات شائع کیے۔ درکائیم کی کتاب 'Suicide' (1897ء) نے عمرانیاتی تجزیئے کو نفسیات یا فلسفے سے ممیز کیا۔ آج 'درکائیم، مارکس اور میکس ویبر[2] کا 'سائنس آف سوسائٹی' کے مفہوم میں معاشرتی علم کے تین بڑے معماروں میں ذکر آتا ہے۔ کارل مارکس نے آگسٹ کومٹے کی اثباتیت[3] کو مسترد کیا ہے تاہم وہ سائنس آف سوسائٹی کو تاریخی مادیت پر تعمیر کرتا تھا۔ میکس ویبر اور جیورگ

---

[1] David Emile Durkheim: ڈیوڈ ایمل درکائیم (1858ء-1917ء) ایک فرانسیسی ماہر سماجیات تھا جس کا نام جدید علم سماجیات کے معمار کارل مارکس (Karl Marx) اور میکس ویبر (Max Weber) کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

[2] Maximilian Carl Emil Weber: کارل ایمیل میکس میلین ویبر (1864ء-1920ء) ایک جرمن فلسفی، ماہر معاشیات اور جدید معاشریات کے بانیوں میں سے ہے۔

[3] Positivism: مثبیت یا اثباتیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے مطابق صرف واقعی علم (Positive Science) کو اصلی علم سمجھا جا سکتا ہے اور وہی علم جو سائنسی طریقہ (Scientific Method) سے حاصل ہو قبول ہو سکتا ہے۔

سمل[1] نے 'سوشیالوجیکل اینٹی پازیٹوازم' (sociological anti-positivism) کو فروغ دے کر معاشرتی فکر کے تین طریق ہائے عمل کو مدغم کیا بالخصوص درکائیمین اثباتیت (Durkheimian positivism) اور ساختیاتی فعلیت (Structural functionalism)، مارکس کی تاریخی مادیت (Marxist historical materialism) اور نظریۂ آویزش (conflict theory) اور ویبر کی ضدِ اثباتیت (Weberian antipositivism) اور ورسٹیہن تجزیہ (Verstehen analysis)۔ 1920ء کے عشرے میں شکاگو سکول نے علامتی باہمی تعلقات (Symbolic interactionism) وضع کی اور فرینکفرٹ سکول نے مارکس، فرائڈ اور نطشے کے افکار پر مبنی تنقیدی نظریہ پیش کر دیا۔ عمرانیات جدیدیت مثلاً صنعتی ارتقاء، شہری آبادیوں پر پڑنے والے دباؤ، لادینیت اور بڑھتے ہوئے سلسلۂ توجیہات کے چیلنجز کے علمی ردعمل کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

4 نئے معاشی افکار

مغرب میں اقتصادیات / معاشیات علم کی کوئی علیحدہ شاخ نہیں تھی بلکہ یہ صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) تک فلسفے کا ایک حصہ رہی۔ تاہم اقتصادی یا معاشی فکر کی تاریخ قدیم یونانی فلسفیوں سے ماخوذ ہے۔ افلاطون کے مکالمے (The Republic) میں ایک مثالی شہری ریاست کا تصور دیا گیا ہے۔ جس کا انتظام وانصرام فلسفی بادشاہوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کتاب میں کارکنوں اور پیداوار کے شعبوں کی تخصیص کی گئی ہے۔ افلاطون پہلا مفکر تھا جس نے پیسے کا نظریۂ قرض (Credit theory of money) بیان کیا۔ اس نے ایسے معاشرے کے قیام پر بھی زور دیا، جس میں تمام وسائل مشترکہ ملکیت میں ہوں۔ ارسطو نے اپنی کتاب 'Politics' (350 قبل مسیح) میں طبقۂ امراء کی چندسری حکومت (Oligarchy) کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ وسائل کی مشترکہ ملکیت طبقۂ امراء کی ایک لعنت (anathema) ہے۔ لہٰذا

---

[1] Georg Simmel: جارج سمل (1858ء–1918ء) ایک جرمن فلاسفر، ماہر سماجیات اور نقاد تھا۔

یہ بہت بہتر ہوگا کہ ساری جائیداد نجی (private) ہومگر اس کا استعمال عام ہو۔ قانون سازوں کو خصوصی اقدام کے طور پر مردوں میں فیض رسانی (benevolent disposition) کا مزاج پیدا کرنا چاہیے۔ ارسطو سود کو سخت ناپسند کرتا اور کہتا تھا کہ اجارہ داری (monopoly) کے ذریعے دولت کمانا ایک ڈھلائی ہوئی تحقیر (cast scorn) ہے۔

ٹامس ایکوناس ایک اطالوی ماہر دینیات (theologian) اور معاشیات نویس تھا۔ اس نے اپنے مقالہ 'Summa Theologica' میں منصفانہ قیمتوں کے تصور پر روشنی ڈالی۔ ڈنس سکاٹس[۱] نے اپنی کتاب 'Sententiae' میں محنت کشوں کی مزدوری، اخراجات اور منصفانہ قیمتوں کے تعین میں عوام کے کردار پر اظہار خیال کیا۔ ژان بوریدان کا استدلال تھا کہ مارکیٹ پرائس (market price) کا تعین مجموعی، نہ کہ انفرادی مانگ اور رسد کرتی ہیں۔ نکول ارسمہ نے دولت کے ماخذ، نوعیت، قانون اور تبدیلیوں سے متعلق لکھا۔ ٹامس ایکوناس نے اپنی کتاب 'Summa Theologica' میں لکھا کہ تجارتی معاملات میں مداخلت کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے کیونکہ وہ اجتماعی مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد اس کی ذمہ داری ہے۔

کولمبس اور دیگر مہم جوؤں نے نئی دنیا اور ایشیا کے ساتھ تجارت کے لیے نئے نئے راستے کھولے۔ جس سے تجارت کو فروغ ملا۔ نئی دولت ہاتھ آنے سے بادشاہوں کو زیادہ طاقتور فوجی ریاست بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ وہ 'تجارتی نظریۂ زر'[۲] (Mercantilism) کے تحت اپنی حیثیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھا سکیں۔ یہ بادشاہ ریاست کی فوجی قوت استعمال کر کے اس امر کی

---

[۱] Duns Scotus: ڈنس سکاٹس (1266ء-1308ء) زمانہ وسطیٰ کے دینیاتی فلسفہ کے تین ماہرین میں سے ایک تھا جس نے کیتھولک چرچ اور سیکولر سوچ دونوں کو متاثر کیا۔

[۲] اس ماڈل کے مروج ہونے کے باوجود تجارتی نظریۂ زر (Mercantilism) کی اصطلاح 1763ء تک وضع نہیں ہوئی تھی۔

ضمانت حاصل کرنا چاہتے تھے کہ مقامی مارکیٹوں اور رسد کے ذرائع کو ان محاصل کے ذریعے تحفظ ملے تاکہ برآمدات (Export) کی حوصلہ افزائی اور درآمدات (Import) کی حوصلہ شکنی ہو۔ بہ الفاظ دیگر فاضل برآمدات (Export) کے ذریعے ایک مثبت تجارتی توازن قائم ہونا چاہیے۔ جسے اکثر فوجی قوت کی پشت پناہی حاصل ہوتی تھی۔

ٹامس مور[1] نے اپنی کتاب 'Utopia' میں ایک مثالی معاشرے کا نقشہ پیش کیا۔ جس میں زمین سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ تعلیم ہمہ گیر اور مذہبی رواداری عام ہے۔ اس کتاب نے قانون امدادِ غربا[2] (English Poor Laws) کا جذبہ ابھارا اور کمیونزم (Communism) اور سوشلزم (Socialism) کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔ کاپرنیکس نے 'مقداری نظریۂ دولت' اور 'قانونِ گریشم' (بُری دولت اچھی دولت کو دفع کر دیتی ہے) سے متعلق پہلی معروف دلیل پر مبنی کتاب شائع کی۔ ژان بودن[3] نے 'Reply to Malestroit' شائع کی۔ جس میں اس نے افراطِ زر (inflation) کا تجزیہ کیا اور اس کے بارے میں دعویٰ کیا کہ یہ جنوبی امریکہ سے سونا اور چاندی درآمد (import) کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس کے ذریعے اس نے مقداری نظریۂ دولت کی تائید کی۔ لیونارڈس لیمیئس نے 'On Justice and Law' شائع کی جس میں اس نے کہا کہ انشورنس کی قیمت خطرے پر مبنی ہوتی ہے۔

---

[1] Sir Thomas More: سر ٹامس مور (1478ء-1535ء) ایک انگریز وکیل، سماجی فلسفی، مصنف اور نشاط ثانیہ کا معروف انسان دوست تھا جسے کیتھولک کلیسا نے اعزازی طور پر سینٹ ٹامس مور کا خطاب بھی دیا تھا۔

[2] English Poor Laws ناداروں کی امداد کا ایک نظام تھا جو انگلینڈ (England) اور ویلز (Wales) میں چلا آ رہا تھا۔ یہ عہد متوسط کے اواخر میں اور ٹیوڈروں (Tudor) کے زمانے میں شروع ہوا اور اسے 1587-98ء میں قانونی شکل ملی۔

[3] Jean Bodin: ژان بودن (1530ء-1596ء) ایک فرانسیسی قانون دان، سیاسی فلسفی پیرس کی پارلیمنٹ کا رکن اور قانون کا پروفیسر تھا۔

1622ء میں ایڈورڈ مسیلڈن[۱] اور جیرارڈ میلینس[۲] نے غیر ملکی تبادلے (exchange) کے بارے میں جبکہ ٹامس من[۳] نے بیان کیا کہ تجارت دولت بڑھانے کا واحد طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں اس نے متعدد طریق ہائے کار پر روشنی ڈالی۔ ولیم پیٹی[۴] نے اقتصادیات پر فرانسس بیکن کے استدلال پر سائنسی روایت کا اطلاق کیا جو صرف قابل پیمائش مظاہر کو استعمال کرنے اور مقدار کے ٹھیک اور صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس طرح اس کو اولین سائنٹیفک اکانومسٹ (scientific economist) ہونے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ رچرڈ کینٹیلن[۵] نے اپنے 'Essay on the Nature of Commerce in General' میں دلیل دی کہ ایک آزادانہ تصحیح و ترمیم پر مبنی منڈیوں کا نظام، متناسب منافع، نظم وضبط کا قیام اور باہمی طور پر قابل قبول قیمتوں کے تعین میں مددگار رہے گا۔

جان لاک نے اپنے دوسرے مقالے Second Treatise On Civil Government میں کہا کہ حکومت کو نہ صرف عوام کی املاک میں مداخلت سے گریز کرنا چاہیے بلکہ اسے مثبت انداز میں ان کے تحفظ کی ضمانت دینے کا بھی بندوبست کرنا چاہیے (باب 5، دفعات 26-27)۔ ڈیوڈ ھیوم نے اپنی کتاب

---

[۱] Edward Misselden: ایڈورڈ مسیلڈن (1608ء-1654ء) ایک انگریز تاجر تھا جو Mercantilist group of economic thought گروپ کا ممبر تھا۔

[۲] Gerard de Malynes: جیرارڈ میلینس (1585ء-1641ء) غیر ملکی تجارت میں ایک آزاد تاجر، ہسپانوی نیدرلینڈ کا انگریز کمشنر اور تجارتی معاملات پر حکومتی مشیر تھا۔

[۳] Sir Thomas Mun: سر ٹامس من (1571ء-1641ء) ایک انگریز مصنف برائے معیشت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔

[۴] Sir William Petty: سر ولیم پیٹی (1620ء-1687ء) ایک انگریز ماہر معاشیات، سائنسدان، فلاسفر، موجد، برطانیہ کی پارلیمنٹ کا رکن اور رائل سوسائٹی کا چارٹر ممبر تھا۔

[۵] Richard Cantillon: رچرڈ کینٹیلن (1680ء-1734ء) ایک فرانسیسی ماہر معیشت اور مصنف تھا۔

Essays: Moral, Political and Literary

میں زر اندوزانہ مفروضات کی مذمت کرتے ہوئے اس دلیل میں یہ بات شامل کی کہ تجارتی توازن کو موافق بنانے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنا ناپسندیدہ بات ہے۔'فرینسوا کوئز'[۱] نے اس یقین کا اظہار کیا کہ تجارت اور صنعت دولت کے ماخذ نہیں بلکہ فاضل زرعی پیداواریں ہیں جو کرایوں، اجرتوں اور خریداریوں کی صورت میں معیشت کے اندر رواں دواں ہیں، وہی حقیقی اقتصادی محرک ہوتی ہیں۔

1776ء میں ایڈم سمتھ نے

An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations

لکھی جس میں اس نے فطری آزادی کے ایک نظام کے قیام کے لیے کہا۔جس میں ایک فرد معاشرے کے لیے مفید اشیاء کی تخلیق کرتا ہے۔حتیٰ کہ معاشرے کے اندر رہنے والا خودغرض شخص بھی، جب ایک مسابقتی مارکیٹ میں پابندیوں کے تحت کام کر رہا ہو، سب کی بھلائی کا کام کر رہا ہوتا ہے۔اس کا تصورِ آزاد معیشت، محفوظ املاک، سرمائے کی فراہمی، مارکیٹ کی توسیع اور تقسیم، محنت پر مبنی ہوتا ہے۔اس تاجرانہ نظریۂ زر کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔جبکہ نظریہ زراندوزی تمام شر پسندانہ انسانی کارروائیوں کو منظم کرانے کی کوشش کرتا ہے۔سمتھ کے استدلال کے مطابق اتحاد تجار ناپسندیدہ ہوتے ہیں کیونکہ ان میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ اشیا اور خدمات کے معیار اور ان کی پیداوار کی مقدار کو محدود کرلیں۔اس نے اجارہ داری کی حمایت کے لیے ہر قسم کی سرکاری مدد کی مخالفت کی اور کہا کہ غیر مرئی ہاتھ کو بے قید معیشت کے اصولوں پر مبنی اقتصادی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

---

[۱] Francois Quesnay: فرینسوا کوئز (1694ء-1774ء) ایک فرانسیسی ماہر معیشت اور ڈاکٹر تھا۔

جیریمی بینتھم[۱] نے اقتصادیات میں تصورِ افادیت کا اضافہ کیا۔ ڈیوڈ ریکارڈو[۲] نے اپنی کتاب

On the Principles of Political Economy and Taxation

میں بین الاقوامی تجارت کی راہ میں رکاوٹوں پر تنقید کرتے ہوئے وہ طریقہ بتایا جس سے آمدنی کو آبادی کے اندر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس نے کارکنوں، مالکانِ زمین اور سرمایہ داروں کے درمیان فرق واضح کیا اور کہا کہ کارکن وہ ہوتے ہیں جو ایک سطح پر ایک مقررہ اجرت پاتے ہیں، جس پر وہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ مالکانِ زمین جو ایک کرایہ کماتے ہیں اور سرمایہ دار جو سرمائے کے مالک ہوتے ہیں اور ایک منافع کماتے ہیں جو کہ آمدنی کا باقی ماندہ حصہ ہوتا ہے۔ اس نے زراعت کی پیداوار میں کمی کے اصول کی بھی وضاحت کی۔ 1848ء میں جان سٹوارٹ مل نے

Principles of Political Economy

لکھی جو متعدد یونیورسٹیوں میں بطور نصابی کتاب پڑھائی جاتی رہی۔ جان سٹوارٹ مل نے تجارت اور فنیاتی ایجادات (technological innovation) کے مسلسل بڑھتے ہوئے مواقع سے متعلق ایڈم سمتھ کے نظریئے اور آبادی کی فطری تحدید سے متعلق ٹامس مالتھس[۳] کے نظریئے کا درمیانی میدان تلاش کرنے کی کوشش کی۔

کارل مارکس نے متذکرہ بالا ماہرین اقتصادیات کو قدیمی ماہرین معیشت قرار دیتے ہوئے ان کے نظریات کو نظام سرمایہ داری کا نام دیا اور سوشلزم کو ایک متبادل راستے کے طور پر پیش کیا۔

---

[۱] Jeremy Bentham: جیریمی بینتھم (1748ء-1832ء) ایک برطانوی فلسفی، قانون دان اور سماجی اصلاح کار تھا۔ اسے جدید افادیت پسندی کہ صحیح اور غلط کا معیار یہ ہے کہ 'زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ خوشی نصیب ہونی چاہیے'، کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[۲] David Ricardo: ڈیوڈ ریکارڈو (1772ء-1823ء) برطانوی ماہر معاشیات تھا۔

[۳] Thomas Robert Malthus: ٹامس رابرٹ مالتھس (1766ء-1834ء) معروف برطانوی ماہر معاشیات تھا۔ اس نے آبادی کے لیے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق جلد یا بدیر قدرت حرکت میں آتی ہے، تباہی اور زلزلوں کے ذریعے آبادی پھر سے وسائل کے مطابق ہو جاتی ہے۔

اقتصادی اور سیاسی نظریہ جو'دی کمیونسٹ مینی فسٹو'(The Communist Manifesto) اور 'داس کیپٹل'(Das Kapital) میں پیش کیا۔ اس میں اس نے انیسویں صدی عیسوی کے نظام سرمایہ داری کا انقلابی نظریہ فراہم کیا۔ 1844ء میں فریڈرک اینجلز[1] نے

Conditions of the Working Class in England

شائع کی جس میں مانچسٹر کے محنت کشوں کو'ہمارے دور کی معاشرتی بدحالی کی انتہائی غیر پوشیدہ حالت' کے طور پر پیش کیا۔

مارکس نے'دی کمیونسٹ مینی فیسٹو'(The Communist Manifesto) میں لکھا کہ اب تک سارے موجود معاشرے کی تاریخ طبقاتی جنگوں کی تاریخ ہے۔ آزاد آدمی اور غلام، دولت مند اور نادار، جاگیردار اور مزارعہ، سردار اور پیادہ، مختصراً، ظالم اور مظلوم ایک دوسرے کے خلاف پیہم برسرِپیکار رہے۔ جدید بورژوا معاشرے (bourgeois society) نے پرانے طریقوں کی بجائے نئے طبقوں اور نئے حالاتِ جبر کو جنم دے دیا ہے۔ مارکس نے یہ سوال کر کے محنت کے لحاظ سے قیمت کے تعین کے نظریئے کو سر کے بل کھڑا کر دیا کہ خود مزدور (کام کرنے والے لوگوں) کو وجود میں لانے کے لیے سماجی طور پر لازماً درکار وقت کتنا ہوتا ہے۔ مارکس اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ یہ لوگوں کے لیے قلیل ترین مقدار ہے جس کے اندر رہ کر وہ گزارا کرتے ہیں اور معیشت کو رواں کرنے کے لیے مطلوب ہنر وجود میں لاتے ہیں۔ اس کے بعد اس طرح سے لوگوں کو پیداوار کے ثمر سے اور ان ذرائع سے بھی بیگانہ کر دیا جاتا ہے۔ جن سے وہ اپنی قوتِ امکانی (potential) کو بڑھا سکیں اور خود کو نفسیاتی طور پر بحال کر سکیں۔ ان کے ساتھ یہ ناانصافی لیبر مارکیٹ میں انہیں تابع ومحکوم رکھ کر کی جاتی ہے۔

---

[1] Friedrich Engels: فریڈرک اینگلز (1820ء-1895ء) جرمنی کا انقلابی مفکر تھا جس نے کارل مارکس (Karl Marx) کے ساتھ مل کر سائنسی سوشلزم کی بنیاد رکھی۔ اس نے تک جرمنی، فرانس، اور بیلجیم میں انقلابی تحریکیں چلائیں اور مارکس کے ساتھ مل کر کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں کمیونسٹ مینی فسٹو (1848ء) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

آجر اپنے کارکنوں پر جبر کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ محنت کراتے ہیں۔ ایسی مشینری بنانے پر سرمایہ کاری کرتے ہیں جن میں مزدور کی ضرورت نہ رہے۔ اپنا منافع بڑھاتے اور پیداوار کو پھیلاتے چلے جاتے ہیں مگر صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں جو ان ذرائع پیداوار کے اندر نجی ملکیت رکھتے ہیں۔ محنت کش طبقے اس دوران رفتہ رفتہ خستہ حالی سے دو چار ہوتے رہتے ہیں۔ جب بے روزگاروں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے تو ان کی ریزرو فوج بھی مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ بے روزگاری، مانگ (demand) میں کمی لانا شروع کر دیتی ہے کیونکہ عوام کی اشیاء خریدنے کی سکت (purchasing power) پیچھے رہ جاتی ہے اور فروخت نہ ہو سکنے والی اشیاء کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اقتصادی کساد بازاری (economic depression) کی صورت میں نکلتا ہے۔ منڈیوں میں ضرورت سے زیادہ بھرے ہوئے مال کی نکاسی ہو جائے تو نئے مال کی آمد کا چکر شروع ہونے سے پہلے معیشت پھر سے برسنا گرجنا شروع کر دے گی۔ مارکس کا خیال تھا کہ ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ سرمایہ داروں اور کارکنوں کے دو برعکس رجحانات کے درمیان کشیدگی اور چپقلش میں شدت بڑھتی چلی جائے گی بالآخر مارکس کی خیالی تصویر کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت ایک انقلاب آ جائے گا اور اس کے نتیجے میں غیر طبقاتی معاشرہ تخلیق ہو جائے گا۔

مارکس نے معیشت دانوں میں ایک رجحان پیدا کرنا شروع کر دیا جو عملی اقدام کے قائل ہو گئے۔

ان میں روزا لکسمبرگ [۱]، مارٹا بیٹریس ویب [۲] اور سڈنی ویب [۳] شامل تھے۔ جنھوں نے فیبین سوسائٹی (Fabian Society) کی بنیاد ڈالی اور لندن سکول آف اکنامکس قائم کیا۔

الفریڈ مارشل [۴] یونیورسٹی آف کیمبرج کا پہلا پروفیسر تھا جس نے 'Principles of Economics' لکھی۔ یہ اس وقت رائج جان سٹوارٹ مل کی 'Principles of Political Economy' کی نصابی کتاب کی متبادل تسلیم کر لی گئی۔ اس کتاب میں مارشل نے 'پولیٹیکل اکانومی' (political economy) کی اصطلاح ترک کرکے اپنی 'Economics' کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کردی۔ آج کل اس مضمون کے لیے یہی اصطلاح مروّج ہے۔

جان مینارڈ کینز [۵] کیمبرج یونیورسٹی میں الفریڈ مارشل کا شاگرد تھا اور اس نے ورسائی کانفرنس (Versailles Conference) میں برطانوی حکومت کے مالیاتی نمائندے کے طور پر شرکت کی جہاں اس نے کئے جانے والے فیصلوں سے سخت اختلاف کیا تھا۔ اس کے مشاہدات اس کی

---

[۱] Rosa Luxemburg: روزا لکسمبرگ (1871ء-1919ء) ایک فلسفی، ماہر معاشیات، پولینڈ اور لیتھویانا کی سماجی جمہوریت پارٹی، جرمن سماجی وجمہوری پارٹی، جرمنی کی سماج وجمہور پارٹی اور جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی کی رکن اور پولینڈ کی یہودی تحریکوں کی کارکن تھی۔

[۲] Martha Beatrice Webb: مارٹا بیٹرس ویب (1858ء- 1943ء) ایک انگریز ماہر سماجیات، اقتصادیات، سوشلسٹ، مزدوروں کی مؤرخ، سماجی اصلاح کار اور لندن سکول آف اکنامکس کی بانی تھی۔

[۳] Sidney James Webb: سڈنی جیمز ویب (1859ء- 1947ء) ایک برطانوی سوشلسٹ، ماہر اقتصادیات، سماجی اصلاح کار اور لندن سکول آف اکنامکس کا شریک بانی تھا۔

[۴] Alfred Marshall: الفریڈ مارشل (1842ء-1924ء) اپنے دور کا قابل ترین ماہر معاشیات تھا۔ اس نے پہلی دفعہ costs of production, marginal utility,supply and demand کے نظریات متعارف کروائے۔

[۵] John Maynard Keynes: جان مینارڈ کینز (1883ء-1946ء) ایک انگریز ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔ اس نے کئی سالوں تک رائل کمیشن برائے ہندوستانی کرنسی اور مالیات کے لیے کام کیا۔ اس کی کوششوں سے آئی ایم ایف وجود میں آیا۔

کتاب Economic Consequences of Peace (1919) میں ریکارڈ شدہ ہیں۔
کینز نے یہ موقف پیش کیا کہ اگر فاتحین جبر کر کے جنگ کا تاوان شکست خوردہ محوری ممالک پر ڈال دیں تو ایک عالمی بحران آ جائے گا۔ یہ بحران ایک نئی عالمی جنگ کا سبب بن جائے گا۔ کینز نے تجویز دی کہ جرمنی پر تاوان کی رقم کم کر کے اسے حقیقی طور پر نیچے کی سطح پر لایا جائے۔ کوئلے کی بڑھتی ہوئی بین الحکومتی انتظامیہ کے تحت براعظمی پیداوار اور انجمن اقوام عالم (League of Nations) کی وساطت سے ایک ٹریڈ یونین کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اتحادی ملکوں کے درمیان قرضے کی مجرائی (ادائیگی اور معافی) کا انتظام کیا جائے۔ بین الاقوامی کرنسی کے تبادلے کی مکمل اصلاح کی جائے۔ ایک بین الاقوامی قرضہ فنڈ قائم کر کے روس اور مشرقی یورپ کے تجارتی تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔
عظیم کساد بازاری (The Great Depression) جو 1929ء سے شروع ہوئی بڑھتے بڑھتے 1939ء میں جنگ عظیم دوئم چھڑنے پر منتج ہوئی۔ یہ جنگ ویسے ہی رونما ہوئی جیسے کینز نے اس کی پیشین گوئی کی تھی۔ عظیم کساد بازاری کے دوران ہی کینز نے اپنی نہایت اہم کتاب 'Theory of Employment, Interest and Money 1936' شائع کر دی۔ اس کساد بازاری (The Great Depression) کو وال سٹریٹ کریش آف 1929ء[1] نے آگ لگائی تھی۔ اس کے نتیجے میں امریکہ میں بیروزگاری میں زبردست اضافہ ہونے لگا۔ یورپی مقروضوں سے قرضے واپس مانگ لیے گئے اور پوری دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔ روایتی معیشت دانوں نے اخراجات کو فوراً سکیڑ (tightening) دینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ جب تک تاجروں کا اعتماد اور منافع کی سطح بحال نہیں ہو جاتی یہ سکڑاؤ برقرار رکھا جانا چاہیے۔ لیکن کینز کی دلیل دوسری تھی۔ اس نے پیسے کی سپلائی سے بڑھ کر صارف کے رجحان، سرمایہ کاری کی ترغیب،

[1] Wall Street Crash of 1929: وال سٹریٹ کریش 1929ء متحدہ امریکہ کی سٹاک مارکیٹ کے کریش کو کہا جاتا ہے جس میں عظیم کساد بازاری نے یورپی صنعت وحرفت کو بری طرح متاثر کیا اور امریکی سٹاک مارکیٹ بھی کریش کر گئی۔

سرمائے کی ضمنی کارکردگی، سیالیت کی ترجیح (liquidity preference) اور ضارب (multiplier) کے تبدل پذیر اثر کی نشاندہی کی جو کہ معیشت کی مجموعی کارکردگی، روزگار اور قیمتوں کی سطح کا تعین کرتے ہیں۔ کینز نے کہا کہ روزگار کا انحصار 'مجموعی اخراجات' پر ہوتا ہے جو کہ صارف کے روزمرہ کے خرچ اور نجی شعبے میں تجارتی سرمایہ کاری پر مشتمل ہے۔ اس نے سود کی شرح کم کرنے اور بے روزگاری سے نمٹنے کے لیے آسان قرضے دینے کی تجویز دیتے ہوئے کہا کہ خسارے کے اخراجات قرضہ لے کر پورے کیے جائیں جو کہ دھکے سے چلنے والی اقتصادی سرگرمی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مالیاتی انتظام اور فعال مالیاتی پالیسی، دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مداخلت کارانہ مالیاتی اور محاصلاتی پالیسیاں جن کی کینز کے حامی ماہرین معیشت نے سفارش کی شکاگو یونیورسٹی کے ماہرین معیشت کے ایک گروپ کے حملے کا نشانہ بنیں۔ جنہیں 1950ء کے عشرے میں مجموعی طور پر شکاگو سکول آف اکنامکس کہا جاتا تھا۔ انہوں نے پھر سے منڈی کی سرگرمیوں کا آزادانہ نقطہ نظر پیش کیا اور کہا کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور انہیں اپنے معاملات خود طے کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ ملٹن فرائڈمین[1] جو کہ بیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں شکاگو سکول آف اکنامکس کے ممتاز ترین ماہرین میں سے تھا۔ اس نے 'Monetary History of the United States 1963' لکھی۔ جس میں اس نے کہا کہ عالمی کساد بازاری فیڈرل بنک کی پالیسیوں کا نتیجہ تھی۔ بے قید سرکاری پالیسی معیشت میں سرکار کی مداخلت سے کہیں زیادہ مفید عمل ہے۔ حکومتوں کو غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرنی چاہیے تاکہ طویل المیعاد اقتصادی افزائش عمل میں آئے اور اس کے لیے پیسے کے پھیلاؤ میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہے۔ چونکہ عمومی قیمتوں کا تعین پیسے سے ہوتا ہے اس لیے فعال مالیاتی (آسان قرضے) یا محاصل (ٹیکس اور اخراجات) پالیسی غیر ارادی منفی اثرات ڈال سکتی ہے۔ معقولیت

[1] Milton Friedman: ملٹن فرائڈمین (1912ء-2006ء) امریکی ماہر اقتصادیات تھا جسے اقتصادی سائنس میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

پسند صارفین جس آمدنی کو اپنی مستقل آمدنی سمجھیں گے، اس میں سے ایک متناسب رقم ہی خرچ کریں گے اور اچانک کہیں سے آ جانے والی رقم میں سے بیشتر حصے کو اپنی بچت میں جمع کریں گے اور یہ کہ معقول صارفین پیش بینی کر سکیں گے کہ بعد میں ٹیکسوں میں لازماً اضافہ ہو جائے گا جس سے پبلک مالیات متوازن ہو جائیں گی۔ یہ وہ معاشی افکار ہیں جن کی وجہ سے آج کی عالمی معیشت بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک سیکنڈ میں ہزاروں ارب روپے کی تجارت ہوتی ہے اور جدید سائنس کی وجہ سے یہ تجارت زیادہ تر کمپیوٹر پر ہوتی ہے۔

5 نیا اصول قانون

قانون، قواعد کا ایک ایسا نظام ہے جو معاشرتی اداروں کے ذریعے انسانی رویئے کو قابو میں لاتا ہے۔ قوانین تین طریقوں سے بنائے جا سکتے ہیں۔ انہیں ایک اجتماعی مجلس قانون ساز، یا اکیلا رکنِ مجلس قانون ساز یا انتظامی اختیارات رکھنے والا حاکم بذریعہ قواعد و احکامات بناتا ہے یا جج بذریعہ واجب التعمیل نظائر (binding precedents) بناتے ہیں۔ قانون سیاست، اقتصادیات، تاریخ اور معاشرے کو مختلف طریقوں سے متشکل کرتا ہے۔ لوگوں کے مابین تعلقات کو بطور مصالحت کنندہ منضبط کرتا ہے اور بیک وقت وہ معاشرے کی ایک پیداوار بھی ہوتا ہے۔ قانون کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ قانون (فقہ) فلسفہ قانون (اصول فقہ) اور مدتوں سے چلا آنے والا مطبوعہ قانون (black letter law)۔

فلسفہ قانون (اصول فقہ) کے ابتدائی آثار مختلف مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں جبکہ رسمی مکاتبِ قانون سلطنت روما کے تحت تخلیق ہوئے اور 'Justinian Corpus Juris Civilis' تک جا پہنچے۔ فطری قانون کے قدیم نظریہ سازوں کا دعویٰ تھا کہ کچھ ایسے قوانین ہیں جو کائنات کے اندر مرتسم و منقش (Jus natural) ہیں۔ پس انسان کے بنائے قوانین کو حتی الوسع ان کے قریب ترین ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ 'Lex iniusta non est lex' پر مبنی ہے جس کے معنی ہیں کہ ایک غیر منصفانہ قانون، صحیح قانون نہیں ہوتا۔

ٹامس ایکوناس نے قوانین کی چار اقسام کی نشاندہی کی ہے: دائمی، فطری، انسانی اور سماوی۔ اول الذکر ماورائے عقل یا وجدانی قوانین ہوتے ہیں۔ جنہیں صرف خدا تعالیٰ جانتا ہے۔ فطری قانون معقول انسانی مخلوق کی دائمی قانون میں شرکت کے حوالے سے ہوتے ہیں اور انہیں عقل کے ذریعے دریافت کیا جاتا ہے۔ سماوی قانون کا اظہار مذہبی کتابوں کے ذریعے ہوتا ہے اور یہ بنی نوع انسان کے لیے خدا تعالیٰ کا ایک مثبت قانون ہوتا ہے۔ انسانی قانون کو عقل کی مدد حاصل ہوتی ہے اور یہ انسانوں کے مشترکہ مفاد کے لیے بنایا جاتا ہے۔ فرانسسکو ڈی ویٹوریا[1] شاید پہلا آدمی تھا جس نے نظریہ "Jus gentium" (عوام کے حقوق) متعارف کرایا اور اس کی وضاحت کی۔ ہوگو گروشیئش فطری قانون کے خالص عقلی نظام کا بانی تھا۔ اس کا استدلال تھا کہ قانون معاشرتی تحرک اور عقل، دونوں کی پیداوار ہے۔ کانٹ کا یقین تھا کہ ایک اخلاقی حکم ایسے قوانین کا متقاضی ہوتا ہے 'جو عالمگیر قوانین فطرت میں سے چنے گئے ہوں'۔

کانٹ پر نطشے نے تنقید کی اور اصول مساوات کو مسترد کرتے ہوئے اس ایقان کا اظہار کیا کہ قانون رغبتِ اقتدار میں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس پر اخلاقی یا غیر اخلاقی کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ بیسویں صدی عیسوی میں لون لووائس فلر[2] نے اس امر پر زور دیا کہ قانون میں ایک داخلی اخلاقِ اقتدار ہوتا ہے جو ان معاشرتی قواعد کے پار چلا جاتا ہے جن سے جائز قانون بنائے جاتے ہیں۔

دوسری طرف اجابیت پسندوں (Positivists) کا استدلال یہ تھا کہ قانون کچھ ایسی چیز ہے جسے حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ قوانین اس وقت جائز طور پر بنایا جاتا ہے جب وہ معاشرتی

---

[1] Francisco de Vitoria: فرانسسکو ڈی ویٹوریا (1483ء-1546ء) ایک سپینی رومن کیتھولک فلاسفر، ماہر دینیات اور قانون دان تھا۔ وہ فلسفے کی ایک روایت سکول آف سلامانکا کا بانی تھا۔

[2] Lon Luvois Fuller: لون لووائس فلر (1902ء-1978ء) ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک ممتاز پروفیسر تھا۔ اس کو امریکی قانون برائے معاہدات کے سلسلے میں اہم کردار کا حامل تسلیم کیا جاتا ہے۔

لحاظ سے قبول کردہ قواعد سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جیریمی بینتھم کے نقطۂ نظر کے مطابق قوانین اس طرح وضع کئے جانے چاہئیں کہ وہ ممکنہ طور پر افراد کی سب سے بڑی تعداد کے لیے بہترین نتائج دے سکیں۔ اس کے شاگردوں جان سٹوئرٹ مل اور جان آسٹن[۱] نے اس نظریئے کو قبول کر لیا۔ جان آسٹن نے قانون کی یہ تصریح کی کہ یہ وہ احکامات ہوتے ہیں، جن کی پشت پر حاکمیت اعلیٰ کی طرف سے سزا کی دھمکی (Threat of Sanctions) ہوتی ہے۔ ان احکامات کا رُخ ان عوام کی جانب ہوتا ہے جو اطاعت گزاری کی عادت رکھتے ہیں۔

ہینس کیلسن[۲] قانون کی توضیح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ شیرازہ بند طور طریقے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ ہی ان طور طریقوں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے سے انکار کرتا ہے۔ یعنی قانونی سائنس کو قانونی سیاسیات سے علیحدہ رکھا جانا چاہیے۔ اس کے 'خالص نظریۂ قانون' (Pure Theory of Law) کا مرکز ایک بنیادی قاعدہ (Grundnorm) ایک تصوراتی قاعدہ ہے بلکہ یوں کہیے کہ ایک مفروضہ ہے جسے شاہی نظام کے ایک قانون دان نے دلیل کی بنیاد بنایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک قانونی نظام کی تمام زیریں سطحیں جو دستوری قانون سے شروع ہوتی ہیں، ان کے بارے میں یہ رائے ہے کہ انہوں نے اپنا اختیار حاکم مجاز سے لیا ہے۔ لہٰذا قانونی روایات کے وجوب کو آخری سرے یعنی کسی مافوق الانسان ذریعے مثلاً خدا، ریاست یا قوم تک جا پہنچے بغیر ہی طے شدہ سمجھا جا سکتا ہے۔

[۱] John Austin: جان آسٹن (1790ء۔1859ء) ایک برطانوی ماہر قانون تھا، جس کی مطبوعات نے 'برطانوی اصولِ قانون' پر بے پناہ اثرات ڈالے۔

[۲] Hans Kelsen: ہینس کیلسن (1881ء-1973ء) ایک آسٹرین قانونی فلسفی اور سیاسی فلسفی تھا جو 1940ء میں ترک وطن کر کے امریکہ چلا گیا تھا۔

تاہم ہربرٹ لایونل ایڈالفس ہارٹ[۱] جیسے قانونی ایجابیت پسندوں (positivists) نے آسٹن اور کیلسن پر تنقید کرتے ہوئے یہ استدلال کیا ہے کہ قانون کو معاشرتی اقدار کا ایک نظام سمجھا جانا چاہیے اور یہ کہ تکلفاتِ نافذہ (sanctions) قانون کے لیے ضروری تھے۔ قانون جیسے معیاری معاشرتی مظہر کی بنیاد غیر معیاری معاشرتی حقائق میں پیوست نہیں کی جاسکتی۔ ہارٹ نے مزید کہا کہ قانون ایک مجموعۂ قواعد ہے جو قدیم ترین قواعد (rules of conduct) طرز ہائے عمل اور ثانوی قواعد (ایسے قواعد جو حکام کے لیے ہیں کہ وہ کس طرح قدیم ترین قواعد پر عمل درآمد کرائیں) پر مشتمل ہے۔ ثانوی قواعد طریق ہائے عدل (rules of adjudication) میں منقسم ہیں (تا کہ قانونی تنازعات حل کرائے جاسکیں) ان میں قواعد تغیر (rules of change) (جو قانون میں ردوبدل کرنے کی اجازت دیتے ہیں) اور قاعدۂ شناخت (rule of recognition) (جو قانون کے جائز ہونے کی شناخت کرتا ہے) شامل ہیں۔ قاعدۂ شناخت (rule of recognition) حکام کے روزمرہ کا طرز عمل ہے (بالخصوص بیرسٹرز اور ججز کا طرز عمل) جو کہ چند حقائق کی نشاندہی کرتا ہے اور فیصلے بطور ماخذ قانون صادر کرتا ہے۔

جان بارڈلے رالس[۲] کا نظریۂ انصاف ایک خاکے (device) کو استعمال کرتا ہے جسے تخلیقی موقف کہتے ہوئے وہ ہم سے سوال کرتا ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے بنیادی اداروں کو باقاعدہ بنانے کے لیے انصاف کے کون سے اصولوں کا انتخاب کریں گے، اگر ہم لاعلمی کے پس پردہ بیٹھے ہوئے ہوتے؟ تصور کیجیے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں؟ ہماری صنف کیا ہے؟ ہمارے پاس کتنی دولت ہے؟ ہمارا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ یا ہماری شناخت کے خدوخال کیا ہیں؟ تا کہ ہم اپنے

---

[۱] Herbert Lionel Adolphus Hart: ہربرٹ لایونل ایڈالفس ہارٹ (1907ء - 1992ء) ایک معروف برطانوی قانونی و سیاسی فلاسفر تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں اصول قانون کا پروفیسر اور بریز نیوز کالج آکسفورڈ کا پرنسپل بھی رہا۔

[۲] John Bordley Rawls: جان بارڈلے رالز (1921ء-2002ء) ایک امریکی اخلاقیات اور سیاسی فلسفے کا استاد تھا۔ وہ ہارورڈ اور آکسفورڈ کی پروفیسر شپ پر بھی فائز رہا۔

حق میں کسی تعصب سے کام نہ لے سکیں۔ رالس دلیل دیتا ہے کہ اس تخلیقی موقف سے ہم بالکل انہی سیاسی آزادیوں کا ہر ایک کے لیے انتخاب کریں گے مثلاً آزادیٔ اظہار اور حق رائے دہی وغیرہ۔

فلسفۂ قانون کے اصولوں (Jurisprudential doctrines) کی بنیاد پر قانون کے دو بڑے بڑے نظام ظہور پذیر ہوئے ہیں: شہری قانون (civil law) اور رواجی قانون یا قانون عامہ (common law)۔ اول الذکر قانون ایسا نظامِ قانون ہے جو آج دنیا بھر میں بیشتر ممالک میں استعمال ہوتا ہے۔ اس قانون میں جن ماخذ کو مستند سمجھا جاتا ہے وہ ابتدائی طور پر قانون سازی اور رواج تھے۔ شہری قانون کی تبویب (codification) جو کافی حد تک رومن لاء پر مبنی تھی، اس کے ساتھ ساتھ بعض اثرات مذہبی قوانین (جیسے کہ کلیسا کا قانون) کے بھی تھے جو عہد روشن خیالی (Enlightenment) تک پورے یورپ میں پھیلتے رہے۔ پھر انیسویں صدی عیسوی میں فرانس نے اپنے قوانین کو مع اپنے 'کوڈ سول'[1] اور جرمنی نے اپنے قوانین کو مع اپنے[2] کے جدید بنا لیا ہے۔ ان دو ملکوں کے مجموعہ ہائے قوانین نے براعظم یورپ کے تمام ملکوں (بشمول یونان) کے قانونی نظاموں پر بے پناہ اثرات مرتب کئے بلکہ جاپانی اور کوریائی قانونی روایات کو بھی متاثر کیا۔ آج جن ملکوں میں شہری قانون کے نظام کام کر رہے ہیں ان میں روس اور چین سے لے کر وسطی اور لاطینی امریکہ تک شامل ہیں۔

'قانونِ عامہ' یا 'رواجی قانون' (common law) کے تحت بنے ہوئے قانونی نظاموں میں عدالتوں کے فیصلوں کو قطعی طور پر قانون مانا جاتا ہے۔ جو مجلس قانون ساز (پارلیمنٹ) کے طریق کار کے مطابق بنے قوانین (قوانین موضوعہ) کے مساوی ہوتے ہیں۔ ان کے تحت ضابطے انتظامی شاخ وضع کرتی ہے۔ قانون میں عدالتی فیصلوں کی یہ مساوی حیثیت اصول نظائر (stare

[1] Code Civil des Francais: فرانس کا سول کوڈ
[2] Burgerliches gesetzbuch: جرمنی کا سول کوڈ

decisis) کی رُو سے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے ماتحت عدالتوں کے لیے واجب التعمیل ہیں اور اسی عدالت کے مستقبل کے فیصلے بھی قابل تعمیل ہوں گے تاکہ مماثل مقدمات (similar cases) کے نتائج بھی مماثل ہونے کی ضمانت حاصل ہو سکے۔

'قانون عامہ' (Common law) نے ہنری دوم[1] کے دور میں (1100ء کے اواخر میں) فروغ پایا۔ جب اس نے ایسے ججوں کو تعینات کیا جو ملک کے لیے ایک مشترکہ اداراتی اور متحدہ نظام قانون وضع کرنے کا اختیار اور صلاحیت رکھتے تھے۔ قانونِ عامہ کے ارتقا کے لیے اگلا بڑا قدم 1215ء کا منشورِ عظیم میگنا کارٹا تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ بادشاہ کے ہمراہی ججوں کی عدالتیں اپنے اجلاس اور فیصلے ایک خاص جگہ پر منعقد کریں نہ کہ ملک کی ناقابل پیشنگوئی جگہوں پر اجلاس کر کے اپنی پسند کا انصاف بانٹتے پھریں۔ جب قانونِ عامہ کا نظام ناقابل یقین حد تک ضابطہ بند، سخت گیر اور بے لچک ہو گیا تو اس قانون کے پہلو بہ پہلو ایک باضابطہ ادارۂ نصفت (Equity) بھی وجود میں آ گیا۔ اس نے اپنی کورٹ آف چانسری تشکیل دے دی۔ شروع شروع میں 'نصفت' (Equity) کو اکثر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اسے ڈانواڈول قسم کا قانون قرار دیتے ہوئے کہا جاتا کہ اس کا سائز چانسلر کے قدموں کے برابر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عدالت ہائے نصفت (Equity) ٹھوس اصولوں پر استوار ہوتی چلی گئیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں دونوں نظاموں کو 'نظام قضا'[2] کے تحت یکجا کر دیا گیا۔ اس طرح قانونِ عامہ اور نصفت کی تاریخی طور پر الگ الگ عدالتیں اکٹھی ہو گئیں۔ قانونِ عامہ نے ابتداً انگلینڈ میں جنم لیا۔ جسے بعد میں بہت سے ملکوں نے اختیار کر لیا۔ ایک دفعہ اسے پوری سلطنت برطانیہ میں آزمانے کے بعد، ماسوائے چند مستثنیات (few exceptions) کے، سب ملکوں نے تسلیم کر لیا۔ امریکہ، آسٹریلیا، ہندوستان اور پاکستان میں بھی یہی قانون رائج ہے۔

---

[1] Henry-ii: ہنری دوئم (1133ء-1189ء) انگلستان کا بادشاہ تھا جو 1154ء سے 1189ء تک برسر اقتدار رہا۔

[2] The Judicature Acts 1875ء کے عشرے میں شروع ہونے والے ایکٹس آف پارلیمنٹ کا ایک سلسلہ تھا۔

قانون کے پیچیدہ ہو جانے کی وجہ سے اس کی متعدد زمرہ بندیاں (classifications) کرنا پڑیں۔ آج عمومی طور پر اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: فوجداری قانون (Criminal law) اور دیوانی قانون (Civil law)۔ اول الذکر قانون اس طرزِ عمل سے متعلق ہے جسے معاشرے کے لیے ضرر رساں سمجھا جاتا ہے جس میں قصوروار فریق کو جیل بھجوادیا جاتا ہے یا اس پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے۔ دیوانی قانون (اس قانون کو متذکرہ بالا شہری قانون کے دائرہ سماعت کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا جائے) افراد یا اداروں کے مابین تنازعات دور کرانے جیسے معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نقصان کی تلافی کے لیے تعمیل، مختص، استقرارِ حق (classifications) اور جیتنے والے فریق کے مالی نقصان کے ازالہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ دیوانی قانون نے معاہدات خاص کو جنم دیا ہے۔ مثلاً قانون معاہدات (Contract law)، قانونِ جائیداد (Property law)، قانونِ وقف (Trust law)، قانون ازالۂ نقصان (Tort law)، قانون دستوری (Constitutional law)، قانون انتظامی (Administrative law) اور بین الاقوامی قانون (International law) وغیرہ مہیا کئے ہیں۔

متذکرہ بالا نظریاتی اور عملی پیش قدمیوں نے خصوصی اداروں کے قیام کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اس کے نتیجے میں ایک نمائندہ پارلیمنٹ (representative parliament)، ایک جوابدہ منتظمہ (accountable executive)، آزاد عدالتیں اور انتظامی معاملات کو مناسب طور پر چلانے والی ایک تنظیم (bureaucracy) اور قانونی پیشہ وجود میں آ گیا۔

6 حقوقِ انسانی کا احترام

انسانی حقوق کی اصطلاح کو جنگ عظیم دوئم کے بعد اور اقوام متحدہ کی بنیاد ڈالے جانے پر بہت شہرت حاصل ہوگئی۔ اس نے 'فطری حقوق' (natural rights) یا 'حقوق انسانی' (rights of man) کی جگہ لے لی۔ انسانی حقوق کے تصور کے تاریخی ماخذ پیچھے قدیم یونان اور روم سے جا ملتے ہیں۔ جہاں اس پر یونان اور یونانی رواقیت (Hellenic Stoicism) کے قبل از جدید

فطری قوانین پر مبنی نظریات کے حوالے سے بحث کی جاتی تھی۔ ان نظریات میں اس فطری قانون کی موجودگی کا اعتراف کیا جاتا تھا جو چند ہمہ گیر حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔

1215ء کے منشورِ عظیم میگنا کارٹا (Magna Carta) میں فیصلہ کیا گیا کہ عوام بنیادی حقوق رکھتے ہیں۔ مغربی معاشرے کے قلب ماہیت (metamorphosis) تیرہویں صدی سے شروع ہو کر 'امنِ ویسٹ فالیہ، 1648' (Peace of Westphalia) کے معاہداتِ امن پر دستخط ثبت ہونے تک جاری رہی۔ نشاۃ ثانیہ شروع ہونے اور جاگیرداری کے انحطاط پذیر ہونے کے نتیجے میں آزادی اور مساوات کے کشادہ دلانہ تصورات ابھرنے لگے۔ جن سے جدید دور کے تصوراتِ انسانی حقوق کی بنیادیں استوار ہو گئیں۔ ٹامس ایکوناس اور ہوگو گروشئیش کی تعلیمات منشورِ عظیم 'میگنا کارٹا'، محضر نامۂ حقوق (Petition of Rights) اور انگلستان کے بندوبستِ دستوری (English Bill of Rights) سب نے اس امر کی توثیق کر دی کہ بنی نوع انسان کو چند دائمی اور ناقابل انتقال حقوق فطری طور پر عطا ہوئے ہیں۔

گیلیلیو اور نیوٹن کی دریافتوں، ٹامس ہابز کی مادیت، ڈیکارٹ کی عقلیت، فرانسس بیکن اور جان لاک کی تجربیت اور عہد روشن خیالی میں انسانی عقل پر بڑھتے ہوئے اعتماد نے انسانی معاملات کے تصورِ کاملیت (perfectibility) کی طرف رہنمائی کر دی۔ جان لاک، مونٹیسکیو، والٹیئر[1] اور روسو جیسے فلسفیوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ حالت فطرت کے دوران افراد کو چند حقوق بطور بنی نوع انسان ہونے کے حاصل تھے۔ مہذب معاشرے (سول سوسائٹی) میں داخل ہونے پر (بوجۂ معاہدۂ عمرانی) بنی نوع انسان نے ریاست کو صرف وہ حقوق تفویض کئے تھے جو ان فطری قوانین پر عمل درآمد کے لیے ناگزیر تھے، نہ کہ تمام حقوق ہی اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ ان فطری حقوق کے نفاذ میں ریاست کی ناکامی کی صورت میں

---

[1] Francisco de Vitoria: فرانسسکو ڈی ویٹوریا (1483ء-1546ء) ایک سپینی رومن کیتھولک فلاسفر، ماہر دینیات اور قانون دان تھا۔ وہ فلسفے کی ایک روایت سکول آف سلامانکا کا بانی تھا۔

عامۃ الناس کو بغاوت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس طرح 'نظریۂ نا قابلِ انتقال حقِ انسان' (inalienable right of man) ایک بنیادی اخلاقی اور معاشرتی الہام (social gospel) بن گیا۔

اس بھرپور ذہنی شعور اور گرم جوشی بمعہ 1688ء کے انگلستان میں سنہری انقلاب (Glorious Revolution) کی عملی مثال اور نتیجتاً بندوبست دستوری (Bill of Rights) نے انقلابی شورش کی لہر کے لیے منطقی جواز فراہم کر دیا۔ جس نے شمالی امریکہ اور فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ٹامس جیفرسن[۱] نے اعلان کیا کہ اس کے ہم وطن آزاد لوگ ہیں اور وہ اپنے ان حقوق کے دعویدار ہیں جو انہیں قوانین فطرت سے ملتے ہیں۔ یہ کسی چیف مجسٹریٹ کا عطیہ نہیں ہیں۔ شاعرانہ اعلانِ آزادی میں جو 4 جولائی 1776ء کو 13 امریکی نو آبادیوں کی طرف سے ہوا، کہا گیا کہ 'ہم ان صداقتوں کو اظہر من الشمس قرار دیتے ہیں کہ تمام انسان برابر پیدا کئے گئے اور انہیں ان کے خالق نے چند ایک نا قابل انتقال حقوق عطا کئے ہیں۔ جن میں زندگی، آزادی اور خوشیوں کی تلاش کے حقوق بھی شامل ہیں۔ فرانسیسی اعلانِ حقوق انسان اور حقوق شہریت

(The French Declaration of the Rights of Man and of the Citizen)

میں انگلستان اور امریکہ کی آزادیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی[۲]۔

تحریک عالمگیر حقوقِ انسان (Universal Human Rights Movement)، جنگ عظیم دوئم کے بعد اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس نے چند قانونی دستاویزات کو جنم دیا۔ ان میں سے زیادہ نمایاں اقوام متحدہ کا چارٹر، عالمگیر اعلانِ انسانی حقوق (Universal Declaration of Human Rights, 1948)) ہے۔

---

[۱] Thomas Jefferson: ٹامس جیفرسن (1743ء-1826ء) امریکہ کا تیسرا صدر تھا جو 1801ء سے 1807ء تک برسر اقتدار رہا۔ وہ متحدہ امریکہ کا بانی قائد اور اعلان آزادی کو قلمبند کرنے کا اعزاز بھی اسے ہی حاصل ہوا۔

[۲] Encyclopedia Britannica, article: Human Rights

اقوام متحدہ کا منشور انسانی حقوق کے بارے میں براہ راست کچھ نہیں کہتا۔ اس کے اندر چند ایک حوصلہ افزا اور ترغیبی دفعات ہیں۔ مثلاً انسانی حقوق کے احترام میں اضافہ، انسانی حقوق کے حصول کے لیے دست تعاون بڑھانا، انسانی حقوق کا عالمی سطح پر احترام بڑھانے کے اقدامات کرنا وغیرہ۔ 1946ء میں اقوام متحدہ کی معاشی و معاشرتی کونسل نے کمیشن برائے انسانی حقوق (یو این کمیشن) قائم کیا۔ 1948ء میں اس کمیشن نے ایک مسودہ برائے ڈیکلریشن تیار کیا جسے بنیاد بنا کر جنرل اسمبلی نے اس سال بطور 'عالمی اعلانِ انسانی حقوق' کی قرارداد تیار کی۔ 48 ممالک نے اس کی حمایت کی اور 8 نے رائے شماری میں حصہ لینے سے گریز کیا۔ (اس وقت اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد 56 تھی)۔ یہ قرارداد (ڈیکلریشن) 1976ء میں 'ICCPR' اور 'ICESCR' کے لیے ایک سپرنگ بورڈ (springboard) تھی۔ یہ سب کارنامے انسانی حقوق کے ان نظریہ سازوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھے جن کا سلسلہ ٹامس ہابز سے شروع ہو کر آج کل کے علمبردارانِ حقوق انسانی کی مساعی (efforts) کی بدولت آگے بڑھ رہا ہے۔

عالمگیر اعلان انسانی حقوق 'UNDHR' انسانوں کو درج ذیل حقوق اور آزادیوں سے نوازتا اور ان کا اعلان کرتا ہے:

(i) حق برائے زندگی، آزادی اور سلامتی (آرٹیکل 3)

(ii) آزادی از غلامی و اطاعتِ جبری ((آرٹیکل 4)

(iii) آزادی از اذیت یا رسوا کن سلوک (آرٹیکل 5)

(iv) حقِ شناخت بطور ایک فرد، بہ نگاہِ قانون (آرٹیکل 6)

(v) حقِ مساوات در نگاہِ قانون و مساوی، تحفظِ قانونی (آرٹیکل 7)

(vi) حقِ مؤثر مداوا، اگر حقوق کی پامالی ہوئی ہو (آرٹیکل 8)

(vii) آزادی از بے جا گرفتاری، نظر بندی یا ملک بدری (آرٹیکل 9)

(viii) حقِ جائز و مروجہ انداز سماعت روبرو غیر جانبدار ٹریبونل (آرٹیکل 10)

(ix) یہ حق کہ جرم ثابت ہونے سے قبل بے گناہ سمجھا جائے اور نافذ بہ ماضی فوجداری قانون سے تحفظ (آرٹیکل 11)

(x) حقِ خلوت، خاندان، گھر یا خط و کتابت اور عزت و ناموس کا تحفظ (آرٹیکل 12)

(xi) حقِ آزادیٔ نقل و حرکت اور رہائش (آرٹیکل 13)

(xii) ظلم و ستم سے تحفظ کے لیے پناہ گاہ کی تلاش کا حق (آرٹیکل 14)

(xiii) حقِ قومیت (آرٹیکل 15)

(xiv) حقِ شادی بیاہ اور خاندان سازی (آرٹیکل 16)

(xv) حقِ ملکیتِ املاک (آرٹیکل 17)

(xvi) حقِ آزادیٔ فکر، ضمیر اور مذہب (آرٹیکل 18)

(xvii) حقِ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار (آرٹیکل 19)

(xviii) حقِ پُرامن اجتماع اور انجمن سازی (آرٹیکل 20)

(xix) حقِ شمولیت در حکومت (آرٹیکل 21)

(xx) حقِ معاشرتی تحفظ (آرٹیکل 22)

(xxi) حقِ محنت اور انتخابِ ملازمت (آرٹیکل 23)

(xxii) حقِ آرام و تفریحِ طبع (آرٹیکل 24)

(xxiii) حقِ معیارِ زندگی، مناسب صحت اور خوشحالی (آرٹیکل 25)

(xxiv) حقِ تعلیم (آرٹیکل 26)

(xxv) ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق (آرٹیکل 27)

(xxvi) معاشرتی اور بین الاقوامی نظم میں سہولت کاری کا حق (آرٹیکل 28)

یہ حقوق اور ان کا ایک ایسی ہمہ گیر دستاویز میں اظہار جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تیار کی اور اس پر ووٹ دیا اس سے اس کی عالمی اہمیت کی عکاسی اور ان دانشوروں کی محنت کے عملی اطلاق کا اظہار ہوا۔

تحریک انسانی حقوق بنی نوع انسان کے وقار کے تحفظ اور اس کو سربلند رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہے۔ انسانی وقار جس کا اظہار اقوام متحدہ کے منشور کے دیباچے میں بطور ایک نصب العین کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ 'ہم اقوام متحدہ کے لوگ بنیادی انسانی حقوق، ان کے وقار اور قدر و منزلت کی توثیق کرنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں'۔

یہ اصطلاح عالمی اعلان انسانی حقوق کے دیباچے اور پہلے آرٹیکل میں بھی شامل ہے: ہرگاہ کہ انسانی خاندان کے تمام ارکان کے پیدائشی وقار کی شناخت یہ ہے کہ تمام انسان بلحاظ اپنے وقار اور حقوق کے آزاد اور مساوی پیدا ہوئے ہیں۔ (آرٹیکل ۱)۔ وقار (Dignity) لاطینی لفظ 'Dignitas' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں 'قدر و قیمت'۔ اس کا ایک لُغوی مفہوم قدرتی طور پر موجود ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ افراد سے دوسرے لوگوں کی مرضی کے مطابق محض اوزاروں اور اشیا جیسا سلوک نہ کیا جائے۔ اس کے اندر مضمر معنی یہ ہیں کہ سیاسی، معاشرتی اور قانونی لحاظ سے افراد کے پسندیدہ عقائد، طرز زندگی، رویوں اور پبلک امور میں ان کے طریق کار کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے۔

یہ عقیدہ کہ انسانی حقوق ایک شخص کے وقار میں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے دو ضمنی معنی ہیں: یہ تصور کہ بنیادی حقوق کسی اتھارٹی کے عطا کردہ نہیں ہیں۔ اس لیے وہ چھینے نہیں جا سکتے اور یہ تصور کہ ہر فرد کے حقوق ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی انسانی حقوق میں آزادیوں کی مائل بہ طوالت فہرست میں اب یہ امور بھی شامل ہو چکے ہیں: تنخواہ، حالاتِ کار (work conditions)، ٹریڈ یونینز، معیار زندگی، آرام و فراغت، بہبود و معاشرتی تحفظ، عورتوں اور بچوں کے حقوق اور ماحول۔

- بین الاقوامی اقرارِ شہری و سیاسی حقوق

(International Covenant on Civil and Political Rights, 1976(ICCPR))

- بین الاقوامی حقوق معاش (International Covenant on Economic)
- معاشرتی اور ثقافتی حقوق (Social and Cultural Rights, 1976 (ICESCR))

- یورپین میثاقِ تحفظ انسانی حقوق

(European Convention for the Protection of Human Rights)

- میثاق برائے انسداد امتیازات ہمہ اقسام برخلاف حقوقِ نسواں

(Convention for Elimination of All Forms of Discrimination Against Women, 1979)

- اقرارنامہ برائے انسداد اذیت (Convention Against Torture) اور مع متعدد معاہدات جو بین الاقوامی تنظیم محنت (International Labour Organization) نے کرائے ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں عالمی اور علاقائی معاہدات وجود میں آچکے ہیں۔ ان پر عمل کرنے کے لیے کمیشن، کمیٹیاں اور عدالتیں بن چکی ہیں۔ عہد حاضر میں حقوق انسانی کے بغیر سیاسیات اور معاشیات پر بات کرنا ممکن نہ ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ جدید تہذیب کے پچھلے پانچ سو سالہ عمل کو اگر ہم دو لفظوں میں بند کرنا چاہیں تو ہم با آسانی کہہ سکتے ہیں کہ جدید مغربی تہذیب نے انسان کو دو چیزوں پر زور دینا سکھلایا ہے: (i)۔ عقل، (ii)۔ حقوق انسانی اور یہ عقل اور حقوق انسانی کا عہد ہے۔

5

ہماری علمی بے بسی

شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی[1]

عہد متوسط اور جدید دور میں جب مغرب میں پرانے علوم نئی شکل اختیار کر رہے تھے اور نئے علوم رونما ہو رہے تھے تو مسلم دنیا خواب غفلت کے مزے لے رہی تھی یا پھر پدرم سلطان بود (مرا باپ بادشاہ تھا) پکار رہی تھی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مسیحی علما کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عقل وخرد سے جنم لینے والے علوم اور اس کے نتیجے میں بننے والے اداروں کی مخالفت کر رہی تھی اور انہیں اسلام کی تعلیمات کے خلاف ثابت کر رہی تھی۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ جب مغرب میں علوم وفنون آگے بڑھ کر انسان وکائنات کی تسخیر کر رہے تھے تو اس وقت ہم کیا کر رہے تھے۔

1 سائنس سے بے نیازی

بارہویں صدی عیسوی سے پہلے مسلمان سائنس کے میدان میں چھائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے سائنس کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور اصلاح مذہب (Reformation) اور روشن خیالی (Enlightment) کی تحریکیں اٹھیں مگر مسلم دنیا ان سے بے خبر اور بے تعلق رہی۔ مغربی دنیا اور عیسائی دنیا نے سائنس میں ترقی شروع کی اور وہ سائنس میں استاد بن گئے اور مسلمان ان کے شاگرد بننے لگے اور وہ بھی نکمے حالانکہ اس سے پہلے مسلمان سائنس کے میدان میں استاد تھے اور مغربی ومسیحی دنیا ان کی شاگرد۔

مسلمانوں کے سائنس میں اس زوال کی کئی وجوہات ہیں۔ کچھ فکری اور کچھ عملی۔ فکری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ روایتی مسلمان علما نے معتزلہ کے حامی عباسی خلیفہ مامون الرشید کے ہاتھوں سخت اذیتیں اٹھائیں جو یونانی فلسفہ (ارسطو) کے زیر اثر معتزلہ (عقلی تحریک) کا حامی تھا۔ اس کے اس

[1] بال جبریل

تشدد کے ردعمل میں مسلمان علما میں عقلیت پسندی کے خلاف ایک ردعمل نے جنم لیا اور مامون سے نصف صدی بعد مسلمان دنیا میں فلسفہ کی کتابیں جلائی جانے لگیں۔ معتزلہ کے رد میں اشاعرہ کی تحریک چلی جس کے بعد انتہا پسندوں نے غیر عقلی باتیں کیں۔ اس کے بعد امام غزالیؒ کی تعلیمات کو بھی غیر ضروری طور پر عقل کے خلاف سمجھا جانے لگا حالانکہ وہ صرف یونانی فلسفہ کا علمی رد کر رہے تھے جس نے مسلمانوں کے ذہن کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور علوم کے حصول کے دیگر اہم ذرائع کی طرف توجہ دلا رہے تھے۔ اس کے بعد عام طور پر مسلمانوں میں ایک غیر ضروری غیر عقلی رویے نے جنم لیا جس نے نئے نظریات، نئی تحقیقات وغیرہ کو ناپسند کرنا شروع کر دیا جو سائنس کی ترقی کے لیے ضروری تھیں۔

مدارس کے نصاب میں قرآن پاک، حدیث شریف اور فقہ کے علوم کو اسلامی علوم کہا جانے لگا جس سے ذہن سازی ہونے لگی کہ باقی سائنسی اور دیگر علوم غیر اسلامی ہیں بلکہ سائنسی اور عقلی علوم کے ماہرین اور طلباء کو ناپسند کیا جانے لگا بلکہ ان کو سزائیں دی جانے لگیں۔ عقلیت پسند مسلمان فلاسفر اور عالم ابن رشد پر روایتی علما نے دین سے انحراف کا الزام لگایا۔ خلیفہ مجبور ہو گیا۔ اس نے ابن رشد کو قرطبہ سے نکال کر قریبی یہودیوں کی بستی میں بھیج دیا اور اس کی کتابوں کو جلانے کا حکم دیا۔ ابن رشد نے مراکش میں جا کر پناہ لی۔ مغرب نے اس کے علم و فضل سے بہت فائدہ حاصل کیا مگر مسلمان کئی صدیاں اس سے محروم رہے۔ عظیم مسلمان سائنسدان ابوبکر زکریا رازی کو اتنا مارا گیا کہ وہ نابینا ہو گئے۔ عظیم ترین مسلمان کیمیا دان جابر بن حیان کی وفات جیل میں ہوئی۔ حضرت امام بخاریؒ کو اپنے شہر سے نکال دیا گیا۔ حضرت امام شافعیؒ کو زدوکوب کیا گیا۔ حضرت منصور حلاجؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو قتل کیا گیا۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات ہوئے مگر دوسری طرف مغرب نے اسلامی ثقافت سے حاصل کردہ علم کو استعمال کیا اور اسے بے پناہ ترقی دی۔ مسلمان جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ مثال کے طور پر ریاضی کی کتاب اقلیدس افغانستان، بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان کے دینی

مدارس میں ابھی تک ایک نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے۔ یہ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ نیوٹن اور لائبنیز کے زمانے سے اب تک ریاضی میں بے پناہ تغیرات آ چکے ہیں۔ جدید ریاضی نے انجنیئروں کو حیران کن کمالات دکھانے کی اہلیت عطا کر دی ہے لیکن مدارس کے فارغ التحصیل ایسی ہنرمندی اس لیے نہیں دکھا سکتے کہ ان کی تعلیم زمانے سے پیچھے رہ گئی ہے۔ ہم اپنے مدارس کے طلبا کو اب تک یہی پڑھا رہے ہیں کہ کیمیا میں صرف چار عناصر (elements) ہوتے ہیں: آگ، مٹی، پانی اور ہوا جبکہ مغرب ایک سو اٹھارہ (118) سے زائد عناصر دریافت کر چکا ہے۔ ہم ابھی تک ان کے چار ہونے کے نظریے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ مغرب نے ان ایک سو اٹھارہ (118) عناصر میں سے صرف ایک عنصر یورینیم کو پھاڑا ہے۔ جس سے ایٹم بم بنا لیا ہے۔ اس طرح مغرب اور مسلمانوں کا فرق 118:4 کے تناسب سے ہے۔ اس فرق کو مٹی اور یورینیم کا فرق کہا جا سکتا ہے۔

آیئے ہم ایک مثال لیتے ہیں۔ حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کا شہنشاہ رہا اور وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم حکمران تھا۔ اسے بے پناہ وسائل دستیاب تھے کیونکہ اس وقت کی سلطنتِ مغلیہ، برصغیر دولت مند ترین سلطنت تھی۔ وہ برصغیر پر اس زمانے میں حکمرانی کر رہا تھا جب مغرب میں جدید سائنسز اور فلسفے کو ترقی دی جا رہی تھی۔ اس کی بادشاہت اس تعلیم کے اثرات کو محسوس کر رہی تھی۔ واسکوڈے گاما جس نے مغرب کو ایشیا کا راستہ دکھایا وہ ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر 1499ء میں اتر چکا تھا۔ 1510ء میں پرتگال نے ہندوستان کے ساحلی علاقے گوا پر قبضہ کر لیا تھا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے بعد میں سراج الدولہ[1] اور ٹیپو سلطان کو شکست دیکر ہندوستان پر سیاسی قبضے کی ابتدا کی، سولھویں صدی سے یہاں کام کر رہی تھی۔ لیکن اورنگزیبؒ ان خطرناک سیاسی حقائق سے بالکل بے خبر رہا۔ 1440ء میں پرنٹنگ

---

[1] مرزا محمد سراج الدولہ المعروف نواب سراج الدولہ (1733ء-1757ء) بنگال، بہار اور اڑیسہ کے آخری آزاد حکمران تھے۔ 1757ء میں ان کی شکست سے بنگال میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا۔

پریس لگنے شروع ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاں بادشاہ سلامت اپنے متبرک ہاتھ سے قرآن مجید لکھنا کمال سمجھتے تھے۔ یورپ میں 1455ء میں انجیل مقدس پریس سے چھپ چکی تھی۔ اورنگ زیبؒ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ قرآن پاک کی اشاعت ہی کے لیے پرنٹنگ پریس لگوا لیتا۔ پیرس یونیورسٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی گیارہویں صدی عیسوی میں بن چکی تھیں جبکہ اورنگزیبؒ نے یہ کام اٹھارہویں صدی عیسوی میں بھی نہ کیا[1]۔

1632ء میں اس کے والد محترم شاہجہان نے اپنی بیوی ممتاز محل کی یاد میں اس کا مقبرہ بنوانا شروع کیا جو فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ تاج محل کو دیکھنے کے لیے ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں جبکہ اس کے چار سال بعد 1636ء میں امریکہ کے ایک پادری جان ہارورڈ (John Harvard) نے ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ امریکہ کے آٹھ صدور اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ میں سے ایک سو اکسٹھ (161) کو نوبل پرائز مل چکا ہے۔ اس وقت (2020ء) ہارورڈ یونیورسٹی کے پاس چالیس (40) ارب امریکی ڈالر (6200 ارب روپے) کا وقف (endowment) ہے جبکہ پاکستان کا وفاقی تعلیمی بجٹ (2020ء) 84 ارب روپے کا ہے۔ اس سے ہمارے رہنماؤں کی ترجیحات پر روشنی پڑتی ہے۔

جدید علوم سے یہ بے خبری تھی کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریز فوج کی تعداد صرف پینتالیس ہزار (45000) تھی جبکہ مسلمان فوج کی تعداد اڑھائی لاکھ (250000) تھی لیکن پھر بھی شکست ہمارا مقدر بنی۔ اس لیے کیونکہ ہم جدید علوم سے بے خبر تھے اور انگریز کے پاس توپ اور ٹیلی گرام (Telegram) تھے۔ یہ بات یاد کر کے زخموں پر نمک پڑ جاتا ہے کہ ہم ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں اپنے پیغام کبوتر کے ذریعے بھیجتے تھے۔ برطانوی فوج ٹیلی گرام استعمال کرتی تھی۔ نتیجہ تو یہی نکلنا تھا جس کی توقع کی جا سکتی تھی[2]۔ اس طرح سب سے

[1] Encyclopedia of Britanica, Vol 7, p.761

[2] فکر اسلامی، ص:180

بڑی مسلم مغل سلطنت کو سات ہزار (7000) کلومیٹر دور بیٹھی حکومت کی ایک چھوٹی سی فوج نے شکست دے دی۔

قرآن مجید میں سات سو (700) سے زائد آیات فطرت کے مظاہر سے متعلق ہیں اور بہت سی آیات مبارکہ ہمیں فطرت کے مظاہر میں غور وفکر کا حکم دیتی ہیں لیکن جب انیسویں (19) صدی میں جدید سائنس مسلمان دنیا میں آئی تو مسلمانوں نے اس کو مکمل طور پر قبول نہ کیا اور مسلمانوں میں کئی طبقات سامنے آ گئے۔

(1) ایک طبقے نے جدید سائنس کو گمراہ کن غیر ملکی فکر قرار دے دیا جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہو۔

(2) ایک طبقہ نے کہا کہ مسلمان صرف اور صرف اس وقت ترقی کر سکتے ہیں جب کہ وہ سائنس پر مکمل طور پر عبور پالیں اور اپنی ذہنی سوچ کو سائنسی بنالیں۔

(3) زیادہ تر مسلمانوں نے جدید سائنس کو مذہبی بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کچھ نے کہا کہ جدید سائنس کی تمام جدید دریافتوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ جبکہ کچھ نے کہا کہ اسلامی تعلیمات کو جدید سائنس کی روشنی میں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

(4) کچھ علما نے کہا کہ جدید سائنس کو اس کی غیر اسلامی تعبیرات سے الگ کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے سائنس کی ترقی کی تو تعریف کی مگر کہا کہ سائنس کی دریافتوں اور تعلیمات کی مادہ پرستانہ تعبیر نہ کی جائے بلکہ سائنس ایک خالص علم ہے۔ اس کی فلسفیانہ تعبیر اسلام کے فلسفہ کی روشنی میں کی جاسکتی ہے اور اس طرح سائنس انسان کو خدا کے قریب لاسکتی ہے۔

قصہ مختصر وجوہات جو بھی ہوں مسلمانوں کی روش عام طور پر سائنس اور سائنسی فکر سے بیزاری ہے۔ جس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ آج تک پوری مسلمان دنیا سے صرف تین لوگوں کو سائنس میں نوبل انعام (Nobel Prize) مل سکا ہے اور یہ تینوں مغربی ممالک میں پڑھے ہیں۔ وہاں ہی انہوں نے تحقیق کی ہے۔ ایک کو مسلمان نہیں مانا جاتا اور دوسرے دو بھی اسلام پر روایتی طریقے سے عمل نہیں کرتے۔

2 ملوکیت ہی ملوکیت

مسلم دنیا مجموعی دنیائے انسانیت کے تقریباً پانچویں حصے کی نمائندگی کرتی ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے مسلمان مراکش (Morocco) سے لے کر منڈاناؤ (Mindanao) تک پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا کے وسط پر قابض ہیں۔ یہ ایک طرف امریکہ، یورپ اور روس اور دوسری طرف سیاہ فام افریقہ، بھارت اور چین کے چوراہوں پر براجمان ہیں۔ عباسی خلافت (750ء-1258ء) کے دوران انہوں نے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ اسلام نے ایک عظیم الشان اور وسیع المنظر تہذیب کی تشکیل کی جو صحیفۂ آسمانی کے پیغام اور تین براعظموں میں اس کی توسیع کے دوران وجود میں آنے والی ثقافتوں کی حکمت و دانش اور سائنس پر استوار تھی۔ اس نے کئی عظیم سلطنتوں کو جنم دیا جن میں بجانب مغرب عثمانیوں، ایران کے صفویوں اور برصغیر ہند کے مغلوں کی بادشاہتیں شامل تھیں۔

پھر مغرب نے اٹھنا شروع کیا۔ اولین جدید اسلامی دنیا اٹھارویں صدی عیسوی کی روشن خیالی اور انیسویں صدی عیسوی کے صنعتی انقلاب کی آمد سے اقتصادی اور سیاسی طور پر مضبوط و مستحکم ہو جانے والے مغرب کے پیچھے دھڑام سے گر گئی۔ تقریباً 1800ء میں چھوٹی چھوٹی یورپی اقوام (انگلینڈ، فرانس اور ہالینڈ) نے اسلامی دنیا کے بڑے بڑے خطوں پر اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد مسلمانوں کے جغرافیائی و سیاسی نقشے پر یورپی طرز پر از سر نو منظم ہو جانے والی قومی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں مسلم اہل دانش پر دو یکسر مختلف رجحانات مسلط ہونے لگے جو معاشرتی اور مذہبی تجدید نو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جدیدیت کے علمبرداروں کی تجویز یہ تھی کہ اسلام کو مغربی تصورات کے مطابق ڈھال دیا جائے جبکہ احیا (revivalism) کے حامی، اسلام کی اصل حرکیات (dynamism) کے جوش و جذبے کو بحال کرنے کی ضرورت پر زور دے رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی نقطۂ نظر ایک ہمہ گیر اسلامی خلافت کی خیالی دنیا (utopia) کی طرف رہنمائی

نہیں کر رہا تھا۔ اب اسلام کو چیلنج دیا جا رہا تھا کہ وہ اپنا اظہار خودمختار قوموں کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے کرے۔ جیسا کہ یہ قومیں نسلیت، علاقائیت اور ثقافت پر توجہ مرکوز کرتی ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلامی دنیا نے صدی کے وسط میں ترکی کے سیکولرازم کی گھن گرج کا مشاہدہ کیا تھا جس سے اسے اواخر صدی میں عرب، ایرانی، پاکستانی اور انڈونیشی سیاسی ثقافت میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ سیکولرازم عسکریت پسندی کے رجحانات سے مغلوب ہوتا جا رہا ہے کیونکہ یہاں عوام کی آزادانہ مرضی پر مبنی کوئی حقیقی نمائندہ حکومت نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اسلامی سیاسی فکر کی بنیادیں خود رکھیں اور باہمی مشاورت پر مبنی نظامِ مساوات قائم کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار جانشینوں، خلفائے راشدین نے عوامی فلاح و بہبود کی ترغیب دینے کے لیے انتخابی نظام متعارف کرایا۔ بنی امیہ (658ء - 750ء) جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلہ قریش میں سے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہونے کی بنا پر خود کو حق دار خلافت سمجھتے تھے لیکن انہوں نے ملوکیت متعارف کرا دی۔ اہل تشیع جو قیادت کو خاندانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور خوارج جو انتہائی متقی مسلمان کو مثالی خلیفہ کے طور پر منتخب کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے، دونوں نے بنی امیہ کی قیادت کو چیلنج کر دیا۔

750ء میں شدید قتل و غارت کے بعد عباسیوں کو خلافت مل گئی اور خلیفہ مذہب اور ریاست کے محافظ کے طور پر اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ خلیفہ کو ظل الٰہی تصور کیا جاتا تھا لیکن سیاسی ادارے ابن المقفع[1] کی وجہ سے ایرانی ثقافت کے زیر اثر تھے۔ قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسفؒ نے خلیفہ ہارون الرشید کے حکم پر 'کتاب الخراج' لکھ کر حکمرانی اور مالیاتی امور کے لیے ایک نظیر قائم کر دی۔ انہوں نے خلیفہ کے مقام کی صراحت کرتے ہوئے چرواہے اور اس کے ریوڑ کی مثال دی اور بڑوں اور چھوٹوں کے لیے دین الٰہی کا قیام اس کے لیے فرضِ عین قرار دیا۔ خلیفہ مامون

---

[1] ابن مقفع (متوفی 756ء) ایک ایرانی النسل مترجم، مصنف اور سکالر تھا جس نے عربی زبان میں کتب لکھیں۔

الرشید نے اپنے دورِ خلافت (813ء-833ء) میں یونانی تہذیب کے زیرِ اثر مذہبی طبقے پر خلیفہ کی فوقیت کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ تاہم علماء نے حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی تحریک پر اسلام کے سنی مکتبہ فکر میں اجماع (concensus) کو بنائے اقتدار (authority) بنانے کا موقف پیش کیا جبکہ اہلِ تشیع کا موقف یہ تھا کہ اصل اقتدار امامِ معصوم کی ذات میں مضمر ہے۔

فارابی اور ابن سینا نے سلطنت کے مرکز کے بارے میں غور کیا اور یونانیوں کے زیرِ اثر تصورِ 'فلسفی بادشاہ' کو جو اخلاقی طور پر ایک کامل فرد ہو، ایک اچھی معاشرت رکھنے والے ملک کی سربراہی کے لیے موزوں ترین قرار دیا۔ فارابی کا تصورِ شہر (مدینۃ الفاضلہ) ایک کامل معاشرے کا تھا جس میں معقول طرزِ زندگی، حصولِ سعادت کے لیے ایک معروف ذریعہ تھا۔ جیسا کہ ایک جسم پر حکمرانی کے لیے سر ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کو بھی حکمرانی کے لیے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس معاشرے کو ایک مثالی معاشرہ بننے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ابن سینا نے اپنی کتاب 'الشفاء' میں حکمرانی (سیاسہ) پر ایک باب باندھا ہے۔ اس نے اس باب میں انسانوں کے اصول انحصار باہمی پر زور دیا ہے اور تصورِ قانون دہندہ (law giver) کے لیے فلسفی اور پیغمبر دونوں کی صفات ہونے کو لازم قرار دیا اور کہا کہ ایسا پاکباز شخص ہی دنیوی 'ناموس' اور 'شریعہ' کی ضمانت بن سکتا ہے۔

اہل سنت کی سیاسی بصیرت کا مزید اظہار 'ماوردی'[۱] نے اپنی کتاب 'احکام السلطانیہ' اور نظام الملک[۲] نے اپنی کتاب 'سیاست نامہ' میں کیا۔ عہد متوسط کے اسلامی سیاسی افکار کا بھرپور

---

[۱] ابوالحسن علی بن محمد الماوردی (972ء-1058ء) ایک مشہور اسلامی قانون دان تھا۔ جس نے چیف جسٹس اور سفیر کی خدمات انجام دیں۔

[۲] نظام الملک طوسی (1018ء-1092ء) ایک اسلامی سکالر، قانون دان اور سلجوقی حکومت کا وزیر تھا۔ اس نے سلطنت کو قانونی شکل دینے کے لیے ایک نئے نظریے کی بنیاد رکھی۔

اظہار حضرت امام غزالیؒ اور حضرت امام فخر الدین الرازیؒ[1] نے کیا۔ سپین میں اسلامی سیاسی فکر ابن رشد نے نمایاں طور پر پیش کی جس نے کہا تھا کہ کتاب اللہ، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قانون کی بہترین تشریح وتفسیر کرنے کے لیے فلسفی ہونا ضروری ہے کیونکہ ان کے پاس علم اپنی اعلیٰ ترین صورت میں ہوتا ہے اور یہ کہ مؤثر قانون سازی کے لیے نظریاتی اور تجرباتی، دونوں قسم کے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

شیخ ابن تیمیہؒ نے قرار دیا کہ مذہب اور ریاست ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ کامل روحانی اور دنیاوی خوشحالی صرف اسی وقت ممکن ہے جب مذہب کو شرعی قانون کے تحت روبہ عمل لایا جائے۔ اس کو نافذ کرنے والا شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے کو بطور ذمہ داری قبول کرتا ہو۔ ابن خلدون نے بھی ذہین مدبر اور بابصیرت لوگوں کی حکومت کے قیام پر زور دیا جو مذہبی اصولوں پر مبنی معاشرت کے قیام کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات پر عمل کرے اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز عمل اپنائے۔

عثمانیوں نے فوج، اہل علم اور بیوروکریسی کو ان کی موروثی ریاست میں مدغم کیا اور صوفیانہ نظاموں اور عوامی سطح کے اسلام کے اثرات کے لیے گنجائش نکالی۔ سلطانوں نے انصاف پر بطور عوام کے حقوق و فرائض عمل درآمد ہوتا دیکھ کر ججوں (قاضیوں) کو اختیار دے دیا کہ وہ شریعت اور اپنے اختراعی اور متوازی دیوانی قانون، دونوں کا انتظام و انصرام کریں۔ ابوالسعود[2] نے بطور شیخ الاسلام تعینات ہونے کے بعد سلطان کی مطلق فرماں روائی کے تصور کو مستحکم کرنے کے لیے کام کیا جس سے سلطان کو حتمی مذہبی اور سول حاکمیت حاصل ہو گئی۔ شیخ الاسلام کا استدلال تھا کہ

---

[1] حضرت امام فخر الدین رازیؒ (1149ء-1209ء) ایک نامور مفسر قرآن، محدث، متکلم، تاریخ دان، فقیہ اور فلسفی تھے۔ آپؒ کی وجہ شہرت قرآن پاک کی مایہ ناز تفسیر مفاتیح الغیب ہے جسے تفسیر کبیر اور تفسیر رازی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

[2] (Hoca CelebiEbussuud Efendi)): ابوسعود آفندیؒ (1490ء-1574ء) ایک نامور مفسر قرآن، فقیہ اور قانون دان تھے جنہیں خلافت عثمانیہ میں شیخ الاسلام بھی نامزد کیا گیا۔

قاضی حضرات اپنا دائرۂ اختیار (competence) سلطان کی طرف سے اپنے تقرر سے اخذ کرتے ہیں، جس کی بنا پر وہ اس امر کے پابند ہیں کہ وہ قانونی امور میں اس کے احکامات کی اطاعت کریں۔ کاتب چلبی[۱] نے جو خلافت عثمانیہ کا فاضل ترین عالم تھا، جرّی و عادل سلطان کی حکمرانی کی تائید کی اور سلطنت کے مالی امور کو جائز قرار دیا۔

صفویوں[۲] کے شاہ اسماعیل نے پورے ایران کو اپنے قبضے میں لے کر خود کو زمین پر شیعیت کے بارہویں امام مہدی کے نمائندے کے طور پر پیش کیا اور اعلیٰ ترین دنیاوی اور روحانی اختیارات کو یکجا کر کے ایک ہمہ مقتدر حکمران کے منصب میں ضم کر دیا۔ صفوی خاندان کا نادر شاہ[۳] کے ظہور کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا۔ نادر شاہ نے سارے ایران پر اپنا اقتدار مجتمع کر لیا نتیجتاً قاچار خاندان[۴] کی بادشاہت قائم ہو گئی جو 1779ء سے شروع ہو کر 1925ء تک رہی۔

محقق کرکی[۵] کی تصانیف سے شیعی سیاسی نظریہ پھر سے زندہ ہو گیا۔ اس نے ایک بڑا اشتعال انگیز دعویٰ کیا کہ وہ امامِ غائب کے نمائندے (النائب العم) کے طور پر بولنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس

---

[۱] حاجی خلیفہ کاتب چلبی (1609ء-1657ء) کا اصل نام مصطفیٰ بن عبداللہ تھا جو کاتب چلبی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپؒ ایک مشہور ترکی مؤرخ، سکالر اور خلافت عثمانیہ کی مہم و فتوحات کے عینی شاہد تھے۔ اس کی وجہ شہرت مشہور تصنیف کشف الظنون سے ہے۔

[۲] شاہ اسماعیل اول ایران میں قائم ہونے والی صفوی حکومت (1501ء-1722ء) کا بانی تھا جو اپنے جد امجد شیخ اسحاق صفی الدین کی نسبت سے صفوی کہلواتا تھا۔ اس طرح اس کی قائم کردہ سلطنت کو بھی صفوی سلطنت یا حکومت کہا جانے لگا۔

[۳] نادر شاہ (1688ء-1747ء) جسے نادر شاہ افشار، نادر قلی بیگ اور طہماسپ علی خان بھی کہا جاتا ہے، ایران کا بادشاہ اور خاندان افشار کی حکومت کا بانی تھا۔ اپنی عسکری صلاحیتوں کے باعث مورخین اسے ایشیا کا نپولین اور سکندر ثانی کہتے ہیں۔

[۴] Qajar dynasty: قاچار خاندان ایک ترک النسل ایرانی شاہی خاندان تھا جس نے 1785ء سے 1925ء تک ایران پر حکومت کی۔

[۵] علی بن حسین بن عبدالعالی کرکی العاملی (1466ء-1534ء) ایک نامور اہل تشیع فقیہ تھا جسے ایران کے صفی خاندان نے عراق سے ایران بلا لیا تھا تاکہ ایران میں اہل تشیع عقائد و خیالات کی ترویج میں اس سے مدد لی جا سکے۔

کے نظریات 'اصولی'[۱] عالموں نے قبول کیے اور پھیلائے۔ ان کا کہنا تھا کہ 'مذہبی اختیار' اصول الفقہ کے عمیق مطالعہ سے ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ان 'اصولیوں' کو محمد امین الاسترآبادی[۲] نے للکارا جسے 'اخباری'[۳] کہا جاتا تھا۔ اسے خواب میں 'الہام' ہوا تھا کہ قانون کا واحد ماخذ کیا ہے۔ 'اصولی مجلسی'[۴] نے ریاست کو 'مجاز فقہاء' کے تابع قرار دیا اور کہا کہ 'شاہ' (بادشاہ) طبقہ علما کا 'ہتھیار' ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے صرف 'مجتہد' پر انحصار کرنا ہوگا۔

سنی مسلک مغلوں نے ظہیرالدین محمد بابر[۵] کی زیر کمان 1526ء میں ہندوستان فتح کر لیا۔ اس کے پوتے بادشاہ اکبر نے اسلام کی روایتی سیاسی فکر سے انحراف کر کے خود کو معصوم عنِ الخطا بادشاہ قرار دے دیا۔ وہ بقول خود ایک انسانِ کامل تھا جس کی بنا پر اسے مذہبی اور دنیاوی معاملات میں بلندترین حیثیت حاصل تھی۔ اس نے شریعہ کے فرامین واحکام کو نظر انداز کر کے مذہبی رواداری اور سیاسی مساوات پر مبنی ایک دین اختیار کر لیا۔ شیخ احمد سرہندیؒ نے جو سلسلۂ نقشبندیہ کے پیروکار تھے بادشاہ اکبر کے نظریات کو اسلامی قانون اور مذہب کے لیے تباہ کن قرار

---

۱ اصولی، اہل تشیع اثناعشریہ کا ایک ذیلی فرقہ ہے۔

۲ محمد امین الاسترآبادی اہل تشیع فقیہ تھا جس نے اہل تشیع اثناعشریہ میں ذیلی فرقہ اخباری کی بنیاد رکھی اور اصولی فرقہ کی سخت مخالفت کی۔

۳ اخباری، اثناعشریہ اہل تشیع میں نمودار ہونے والا ایک ذیلی فرقہ ہے جس کی بنیاد محمد امین الاسترآبادی نے رکھی۔ اس فرقہ کے عقائد کے مطابق قرآن، حدیث محمد اور حدیث امامیان عشریہ کی جانب سے آنے والی خبر پر قیام کیا جاتا ہے۔ ان کے مطابق کسی دیگر عالم (علماء) کے اجتہاد کی اہمیت دینی امور میں محض فتاویٰ کی حد تک ہی محدود ہوتی ہے۔ اس فرقہ کے برعکس اصولی فرقہ تھا جس میں علما کو امام کے بارے میں اجتہاد کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔

۴ محمد باقر بن محمد تقی بن المقصود علی مجلسی المعروف علامہ مجلسی (1616ء–1700ء) کا شمار عالم اسلام کے مشہور ترین علماء، فقہا اور محدثین میں ہوتا ہے۔ آپ صفوی دور کے بااثر شیعہ حکام میں سے تھے۔ آپ کتابِ حدیث بحارالانوار کے مؤلف ہیں۔

۵ ظہیرالدین محمد بابر (1483ء–1530ء) ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی تھا۔

دیا۔ وہ اسلامی اقدار کو عوام الناس کی دینی اور سیاسی زندگی میں زندہ و فعال بنانے کے متمنی تھے (اسی لیے انہیں مجدد الف ثانی کہا جاتا تھا)۔ حضرت عبدالحق دہلویؒ[1] شریعت کی سربلندی پر یقین رکھتے تھے اور بادشاہ سے صرف یہ توقع کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو شریعت کا علم بردار کہلانے تک محدود رکھے۔ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ نے اکبر کے فلسفے سے اظہار برأت کیا اور فقہ حنفی پر مبنی عقیدہ اور متفقہ قانونی نظام کو ازسرنو متعارف کروایا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ[2] نے ہندوستان میں شریعہ پر مبنی معاشرت کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ زمین اور ریاست کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ یہاں کے شہری ان لوگوں کی مانند ہیں جو کسی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے لیے یہ امر ممنوعہ ہے کہ وہ کسی اور کے حق انتفاع (right of benefiting) میں مداخلت کریں۔ تمام انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ملک کا مالک اور عوام الناس کا بادشاہ بنے۔ سربراہ ریاست کی حیثیت ایک اثاثے کے منتظم جیسی ہے۔ ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ اسے بلا امتیازِ ذات وعقیدہ روٹی کپڑا اور مکان حاصل ہو۔ اسے شادی کرنے، اپنے بچوں کو تعلیم دلانے اور پرورش کرنے کا بھی حق ہے۔ علاوہ ازیں اسے انصاف، تحفظ زندگی و املاک اور عزت وناموس کی مساوات، حق ملکیت اور یکساں شہری حقوق بھی حاصل ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے دوران نصف مسلم دنیا یورپی ممالک کے نوآبادیاتی نظام کے زیر تسلط آ گئی۔ باہر سے مسلط شدہ کنٹرول کے خلاف مسلم اہل دانش کا داخلی ردعمل ان کے اندر احساس اصلاح واحیا پیدا ہو جانے کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس کی قیادت ان کے اصحابِ دانش اور

---

[1] حضرت عبدالحق محدث دہلویؒ (1551ء - 1642ء) مغلیہ دور میں متحدہ ہندوستان کے مایہ ناز عالم دین اور محدث تھے۔ ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج واشاعت میں آپؒ کا کردار نا قابل فراموش ہے۔

[2] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (1703ء - 1762ء) برصغیر پاک وہند کے ایک مشہور مفکر، اسلامی سکالر، محدث فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا آپؒ نے اس کی رفتار کو تیز کیا۔

سیاسی ومعاشرتی مصلحین کررہے تھے۔ جمال الدین افغانیؒ[1] نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کے ذہین طبقے اوران کی معاشرتی زندگی میں تموج (agitated) پیدا کرنے کے لیے وقف کر دی اورایک اصلاح شدہ مسلم شناخت ابھارنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انھوں نے عوام الناس کومسلمہ مذہبی عقائد اور ممتاز طبقے کو قانون فطرت پر مبنی معقولیت کا درس دیتے ہوئے ہمہ گیر اسلامی ریاست (پان اسلامک سٹیٹ) کو وجود میں لاکرعظمت اسلام کے لیے متحرک ہونے کی ترغیب دی اور کہا کہ اسلام کا حتمی نصب العین رجوع الی اللہ ہے جوحتیٰ الامکان اعلیٰ ترین سیاسی امت کی تشکیل کے لیے جدوجہد کا درس دیتا ہے۔ جمال الدین افغانیؒ کے شاگرد شیخ محمد عبدہؒ[2] اور ان کے رفیق کار رشید رضاؒ[3] نے اسلام کے قرون اولیٰ کی طرف رجوع کرنے کے نصب العین کے لیے جدوجہد کی۔ وہ عمر بھر قرآن وسنت کی تعلیمات اوراجتہاد کے کردار کو بحال کرنے کی اہمیت پر زور دیتے رہے۔ انھوں نے مذہبی فرائض (عبادات) جو نا قابل تغیر خدائی احکامات ہیں اور دیگر انسانوں سے متعلقہ 'معاملات' میں فرق واضح کیا۔ انھوں نے ان کی ازسرنوتشریح کے لیے قیاس واستدلال کو بروئے کار لانے کی تلقین کی تا کہ معاشرے کی بہبود (مصلحہ) کے لیے کام کیا جا سکے۔

سلفیوں کی جدید اصلاحی تحریک کوحضرت امام احمد بن حنبلؒ اور شیخ ابن تیمیہؒ کے افکار سے تقویت ملی۔ جس کا آغاز جمال الدین افغانیؒ، شیخ محمد عبدہؒ اور رشید رضاؒ سے ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری دینی غیرت اورعزتِ نفس صرف اسی وقت بحال ہوگی جب ہم اسلام کو دوبارہ بطور مذہب اور

---

[1] سید محمد جمال الدین افغانی (1839ء- 1897ء) وحدت عالم اسلام کے زبردست داعی اور دنیائے اسلام کی نمایاں شخصیت تھے۔

[2] شیخ محمد عبدہ (1849ء-1905ء) مصری اسلامی سکالر، عالم اور فقیہ تھا جس نے اسلامی افکار کی جدیدیت کے لیے کام کیا۔

[3] محمد رشید رضا (1865ء-1935ء) ایک شامی ماہر علم حدیث وتفسیر، ادب اور تاریخ تھے۔ بعدازاں مصر میں منتقل ہوئے جہاں پر شیخ محمد عبدہ کی شاگردی اختیار کی۔ انھوں نے بیروت سے ایک رسالہ مجلۃ المنار جس میں دینی اصلاح اورعصری تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔

بطور ایک طرزِ زندگی اختیار کر کے مغربی قوتوں کی ثقافتی اطاعت سے نجات پائیں گے اور اپنے داخلی وسائل سے از سر نو قوت حاصل کریں گے۔ سلفیوں نے الجزائر میں عبدالحمید بن بادیسؒ[۱] کی مساعی (کوششوں) سے، مراکش میں محمد علال الفاسیؒ[۲] کی جدوجہد سے اور تیونس میں محمد طاہر بن عاشور[۳] کی قیادت میں گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہابیوں کی تزکیۂ نفس پر مبنی تحریک نے شیخ محمد بن عبدالوہابؒ[۴] کی زیر قیادت اور سعودی عرب کے شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود[۵] کے تعاون وحمایت سے سیاسی بنیاد پرستی کے قوی ترین جذبے اور حکمت عملی سے اپنا کام شروع کیا۔ اس کے زیر اثر اسلامی دنیا کے کئی حصوں میں اس کی مماثل تحریکیں چل پڑیں۔

سر سید احمد خانؒ[۶] ہندوستان میں احیائے اسلام کی ایک بڑی قوت اور مسلم جدیدیت کے بانی بن گئے۔ انہوں نے اسلام کی تشریح اپنے اس کلیے کے مطابق کی کہ خدا تعالیٰ کے افعال اور کلام باہم مماثل ہوتے ہیں یعنی ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اس نے اسلام اور مسلم ثقافت میں معاشرتی اصلاحات کے بارے میں معقولیت پر مبنی طرز فکر اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

---

۱ عبدالحمید بن بادیس (1889ء - 1940ء) الجزائر میں اسلامی افکار کی اصلاح کی تحریک کی مشہور شخصیت تھے جنہوں نے 1931 میں الجزائر میں مختلف مکتبہ فکر کے علماء کی ایک تنظیم قائم کی۔ بعد ازاں اس تنظیم نے الجزائر کی سیاسی صورت حال اور آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

۲ محمد علال فاسیؒ (1910ء-1974ء) مراکش کے ایک معروف سیاستدان، اسلامی سکالر، مصنف، شاعر اور عالم تھے۔

۳ محمد طاہر بن عاشورؒ (1879ء-1973ء) بیسویں صدی کا عظیم اسلامی سکالر، فقیہ اور تعلیمی اصلاح کار تھا۔ اس کی وجہ شہرت قرآن پاک کی تفسیر التحریر والتنویر ہے۔

۴ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ (1703ء-1792ء) موجودہ سعودی عرب کے علاقہ نجد کا معروف اسلامی سکالر، فقیہ اور قائد تھا جس نے وہابی تحریک کی بنیاد رکھی۔ وہابی تحریک نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا اور کئی اختلافات بھی جنم دیے۔

۵ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود (1875ء-1953ء) جدید سعودی عرب کے بانی تھے۔

۶ سر سید احمد خانؒ (1817ء-1898ء) برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری علم کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

حضرت اقبالؒ نے پوری دنیا کو دعوت دی کہ وہ قرآن و سنت کے صحیح اسلام کی حرکیات (dynamism) کے اندر شامل ہو جائیں۔ ایک ایسی حرکیات، جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ تاریخ کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں ساری انسانیت کی اخلاقی تجدید کے لیے بروئے کار لائے گی۔

1924ء میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک[۱] نے شرعی عدالتوں کو منسوخ کر کے نئے دیوانی فوجداری اور تجارتی قواعد نافذ کر دیئے۔ ان سب چیزوں کو لادینیت پر استوار کر دیا جن کی بنا پر ترکی اس وقت مضبوط ترین مسلم سلطنت کہلاتا تھا۔ ترکی ثقافتی اور سیاسی انقلاب کی ایسی مثال بن گیا جو ایک مستبد حکومت نے بزور طاقت مسلط کیا تھا۔ بعدازاں ترکی نے بدیع الزمان سعید نورسیؒ[۲] کے اثرات کی وجہ سے اسلامی ثقافت اور اسلامی طرز زندگی کے لیے عقبی دروازہ کھول دیا۔

بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں مصر کے حسن البنّاؒ[۳] اور سید قطب شہیدؒ[۴] اور پاکستان کے

---

[۱] مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک (1881ء-1938ء) جنگ عظیم اول میں عثمانی دور کا فوجی سالار، جدید سیکولر ترکی کا بانی اور اس کا پہلا صدر تھا۔ کمال اتاترک کے کردار کو اہل اسلام کے ہاں ہمیشہ سے مشکوک تصور کیا جاتا ہے۔

[۲] شیخ بدیع الزماں سعد نورسیؒ (1877ء-1960ء) ترکی سے تعلق رکھنے والے، قرآن کریم، حدیث، فقہ، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ و دیگر علوم وفنون کے ماہر اور جذبہ جہاد سے سرشار ایک ممتاز عالم دین اور صوفی بزرگ تھے۔ آپؒ نے کمال اتاترک کے غیر اسلامی اقدامات کی پرزور مخالفت کی جس کی بنا پر آپؒ کو کئی دفعہ قید وسلاسل کی تکالیف بھی برداشت کرنا پڑیں۔

[۳] حسن احمد عبدالرحمٰن محمد البنّاؒ (1906ء-1949ء) مصر کے ممتاز مذہبی رہنما اور عظیم اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے بانی اور صوفی بزرگ تھے جنہوں نے تصوف کے شاذلی طریقہ میں شیخ عبدالوہاب حصافی کی خدمت میں تکمیل کی۔

[۴] سید قطب شہیدؒ (1906ء-1966ء) ایک ممتاز مصری سکالر، مفسر اور ادیب تھے جو اخوان المسلمین سے وابستہ رہے۔ ان کی شہرہ آفاق کتاب معالم فی الطریق لکھنے پر مصری حکومت کے خلاف سازشیں کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور 25 اگست 1966ء کو پھانسی دے دی گئی۔

مولانا سید ابواعلیٰ مودودی[1] اور ایران کے آیت اللہ خمینی[2] کے اثرات کی وجہ سے اسلامی دنیا میں عمومی قدامت پسندی غالب آ گئی۔ ان تحریکوں نے اسلام کو ایک سیاسی نظریئے کی شکل دے دی۔ حسن البناؒ نے اخوان المسلمین نامی جماعت قائم کر لی جب کہ سید قطب شہیدؒ نے اپنے ذاتی نظم وضبط اور تعلیماتِ جہاد کے ذریعہ سیاسی انقلاب کا منشور لکھا اور جمال عبدالناصر کے مصر کو 'جاہلیۃ' قرار دیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور وہ بیسویں صدی عیسوی میں صف اول کے ترجمانانِ اسلام میں شمار ہونے لگے۔ وہ نظریۂ جہاد کے تحت روحانی اور اخلاقی تعلیمات پر زور دیتے تھے اور مغرب زدگی کے خلاف اپنے شدید جذبات کا اظہار کر کے اسلامی تہذیب کی سربلندی اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے اپنے نظریات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

جناب آیت اللہ خمینی 1950ء کے عشرے میں آیت اللہ بنے اور 1960ء میں 'مرجع' کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ خمینی کے والد کو رضا شاہ پہلوی[3] کے حکم پر قتل کر دیا گیا تھا۔ خود انہیں بھی 1964ء میں عراق میں جلاوطن کیا گیا۔ بعدازاں جب انہوں نے محمد رضا شاہ پہلوی[4] اور مغرب نوازی

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903ء-1979ء) ایک مشہور عالم دین اور مفسر قرآن اور جماعت اسلامی کے بانی تھے۔ ان کا شمار بیسوی صدی کے موثر ترین اسلامی مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کی فکر، سوچ اور ان کی تصانیف نے پوری دنیا کی اسلامی تحاریک کے ارتقا میں گہرا اثر ڈالا۔

[2] روح اللہ خمینی (1902-1989) ایرانی کی قوم کا مشہور روحانی وانقلابی شیعہ رہنما تھا۔ جس نے 1979 میں ایران میں کامیاب شیعہ انقلاب برپا کیا۔

[3] رضا شاہ پہلوی (1878ء- 1944ء) ایران کا بادشاہ تھا جس نے حکومت حاصل کرنے کے لیے 1925ء میں خاندان قاجار کے بادشاہ احمد شاہ قاجار کے خلاف کامیاب بغاوت کی۔

[4] محمد رضا شاہ پہلوی (1919ء-1980ء) ایران کے پہلے پہلوی بادشاہ رضا شاہ کا بیٹا، دوسرا اور آخری پہلوی بادشاہ تھا جس کے خلاف آیت اللہ خمینی نے کامیاب شیعہ اسلامی انقلاب برپا کیا تو وہ خود ہی ملک چھوڑ کر چلا گیا۔

کے خلاف بولنا شروع کیا تو انہیں فرانس میں جلاوطن کر دیا گیا۔انہوں نے جلاوطنی کے دوران ہی سیاسی جدوجہد شروع کر دی۔ جب شاہ کا تختہ الٹ دیا گیا تو وہ یکم فروری 1979ء کو بطور قائد انقلاب ایران واپس آ گئے۔ ایران کے لیے نئے دستور میں شیعہ اسلام کو سرکاری مذہب اور مذہبی لیڈر (ولایت الفقیہ) تسلیم کرلیا گیا۔اگرچہ ایک منتخب صدر ایگزیکٹو برانچ کا سربراہ تھا لیکن اس کے اختیار کے استعمال کی نگرانی ولایت فقیہ کرتا تھا جسے شیعہ فقہا کی مشاورتی کونسل کی حمایت وتائید حاصل تھی۔

مسلمانوں کے جدید سیاسی مفکرین ابھی تک عہد متوسط کے نظریات میں پھنسے ہوئے ہیں۔صرف حضرت محمد اقبالؒ اس سے مستثنٰی تھے لیکن روایتی علماء انہیں زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے۔حضرت اقبالؒ کا استدلال یہ تھا کہ کسی بھی انسانی معاشرہ کے سیاسی افکار اس معاشرہ کے روحانی اور اخلاقی تصورات کے تابع ہونے چاہئیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے ان کے سیاسی افکار اسلام کے روحانی اور اخلاقی افکار کے تابع ہیں اور اسلام کا نصب العین ہر قیمت پر معاشرتی امن کا تحفظ ہے[1]۔ ایسی امت کے لیے بہترین طرز عمل جمہوریت ہوگا۔جس کا نظریہ یہ ہے کہ ایک فرد کو اس کی فطرت کی تمام صلاحیتوں کو ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔اس کے لیے اسے اتنی آزادی استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے جتنی قابلِ عمل ہو اور اس امر سے مشروط ہو کہ اس فرد کی آزادی اس گروہ یا امت کے مفادات کے تابع رہے گی۔

تاہم حضرت اقبالؒ مغربی جمہوریت کو کلی طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ اس کی بجائے انہوں نے جمہوریت کے اپنے فہم کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور مذہب اور ریاست کی علیحدگی کے تصور کو باطل ثابت کیا۔انہوں نے کہا کہ اسلام کی جمہوریت اقتصادی موقع پرستی کی توسیع نہیں ہے۔ یہ ایک روحانی اصول ہے جو اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر فرد و بشر ایک قوتِ پنہاں (latent power) کا مرکز ہے جس کے امکانات (یا استطاعت) کو ایک خاص قسم کے کردار کی تادیب

[1] Thoughts and Reflections of Iqbal, p. 49

کے ساتھ فروغ دیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ آگے بڑھ کر اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ایک معاشرتی زندگی کی تشکیل کریں اور اس روحانی جمہوریت کو فروغ دیں جو کہ اسلام کا اصلی نصب العین ہے[۱]۔

علامہ محمد اقبالؒ کہتے ہیں کہ تہذیب کی اعلیٰ منزل پر جا کر مطلق شخصی اقتدار (personal absolute authority) قابل عمل دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا قانونی حاکمیت اعلیٰ (legal sovereignty) عوام سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام شخصی اقتدار کا کلیتاً مخالف ہے کیونکہ یہ انسان کی انفرادیت کے بھرپور ارتقاء کے لیے ضرررساں ہے۔ حضرت اقبالؒ کے لیے اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ عوام کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا اختیار حاصل ہے لیکن عوام اور ان کے نمائندگان، دونوں کو خدا تعالیٰ کے نازل کردہ قانون (شریعت) کے ڈھانچے کے اندر رہ کر کام کرنا ہوگا۔ شریعت کے نقطۂ نظر سے مذہب اور ریاست دو مختلف وجود نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی چیز ہیں۔ اسلام میں خلیفہ لازمی طور پر اسقف اعظم نہیں ہے۔ وہ روئے زمین پر نمائندہ خدا نہیں ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کی طرح پُرخطا (fallible) ہے اور ہر مسلمان کی طرح اسی قانون کے غیر شخصی حاکم کی رعیت ہے[۲]۔

شریعت کے عام اصول، اہل ایمان کے نقطۂ نظر سے، خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ جن کی تفصیلات طے کرنے کا کام فقہاء کرامؒ کی تعبیر کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے تا کہ وہ پیش آمدہ دنیاوی امور کو نازل شدہ وحی کے مطابق طے کر سکیں۔ تاہم اگر کوئی نئے امور سامنے آئیں جن کے لیے اسلامی قانون میں پہلے سے کوئی مثال موجود نہ ہو تو پوری امتِ مسلمہ کی منشا (اجماع امت) ایک مزید ماخذ قانون (source of law) بن جاتی ہے۔ حضرت اقبالؒ نے تجویز کیا کہ ایک نئی منتخب شدہ اسمبلی میں علماء کو مسلم قانون ساز اسمبلی کا اہم حصہ ہونا چاہیے تا کہ وہ قانون سے متعلقہ

---

[۱] ibid, p. 51

[۲] ibid, p. 51 - 52

سوالات پر آزادانہ بحث ومباحثے کی رہنمائی کرسکیں۔ چنانچہ انہوں نے مجلس قانون ساز اور پارلیمنٹ کے تصور کی پوری حمایت کی جو متذکرہ بالا 'اجماع' کے لیے ایک فورم بنے[۱]۔

حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فی الوقت عالمی خلافت نے مسلم ممالک کی دولتِ مشترکہ (Commonwealth of the Muslim countries) کی جگہ لے لی ہے کیونکہ عالمی امامت عملاً فیل ہوچکی ہے۔ یہ تصور قابل عمل نہیں رہا۔ لہٰذا جدید اسلام کے نظم میں یہ ایک زندہ عامل کے طور پر کام نہیں کرسکتا۔ خلافت کا حقیقی اظہار آزاد وخودمختار اکائیوں کے تنوع کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترکہ روحانی امنگ نے بنا سنوار کر ہم آہنگ کر دیا ہو۔ اسلام نہ تو قومیت (Nationalism) کا حامی ہے اور نہ بادشاہت (Imperialism) کا علمبردار، بلکہ وہ ایک جمعیت اقوام (League of Nations) کا حامی ہے جو مصنوعی حدوں اور نسلی امتیاز کو صرف بحوالہ شناخت تسلیم کرتا ہے جو اس کے ارکان کے معاشرتی افق کو محدود نہ کرتا ہو[۲]۔ انہوں نے مزید کہا کہ دو یا اس سے زیادہ خلافتوں کا بقائے باہمی (co-existence) غیر قانونی نہیں ہے بشرطیکہ وہ مختلف ممالک میں قائم ہوں۔ مزید برآں مسلم تاریخ میں دو رقیب خلافتیں بڑے عرصے تک رہ چکی ہیں[۳]۔

حضرت اقبالؒ نے خلیفہ کے منصب کی اہمیت کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ بدلتے ہوئے حالات میں خلیفہ کا ذکر کسی اور نام سے بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کے نام کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اس کی شرائط منصب (qualifications) کی ہے۔ لہٰذا انہوں نے خلیفہ اور اس کے عمال (وزراء) کی شرائط منصبی (qualifications) کی تفصیلات بتائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ شرائط اضافی اور ذیلی ہیں نہ کہ مطلق۔ ان میں حالات کے مطابق ردوبدل اور ترمیم ہوسکتی ہے۔

اس سلسلے میں حضرت اقبالؒ نے اسلام میں حکمرانی کے ایک اور اہم پہلو، خلیفہ اور اس کی حکومت

---

۱ ibid, p. 61 - 62, 176

۲ ibid, p. 159

۳ ibid, p. 165 - 166

پر عوامی تنقید اور حکمرانی سے اچھے نتائج برآمد نہ ہونے پر خلیفہ کی برطرفی کا معاملہ پر روشنی ڈالی۔ خلافت کے ابتدائی دور میں جب خلیفہ کی برطرفی یا معزولی یا کسی حاکم کا کردار اسلامی تعلیمات کے مطابق اچھا نہیں پایا جاتا تھا تو اس کے خلاف کارروائی مسجد میں عمل میں لائی جاتی تھی۔ حضرت اقبالؒ کا خیال تھا کہ مسجد مسلمانوں کے لیے ایک مجلس یا کچہری کی حیثیت رکھتی ہے اور روزانہ کی نماز کا یہ ادارہ مسلم معاشروں کی سیاسی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ روحانی اور معاشرتی کرداروں کے علاوہ یہ ادارہ حکومت اور ریاست پر مسلسل تنقید کے لیے بھی ایک تیار جگہ کا کام دیتا تھا[1]۔

حضرت اقبالؒ نے منتخب ہونے والوں اور منتخب کرنے والوں کے تعلق کی نوعیت کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ تعلق ایک قسم کا معاہدہ (عقد) ہے جو دونوں فریقوں کو اس امر کے پابند بناتا ہے کہ وہ معاشرے کے کچھ اعلیٰ وارفع مقاصد مل جل کر حاصل کریں۔ خلیفہ چند بنیادی فرائض کا ذمہ دار ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے عالمگیر ہیں۔ مثال کے طور پر اس کا فرض ہے کہ وہ مذہب کی تشریح اور اس کا تحفظ کرے۔ اسلام کے قانون کو نافذ کرے۔ اسلام کے مطابق درآمد و برآمد کے محاصل (levy customs) عائد اور وصول کرے۔ سالانہ تنخواہیں ادا کرے۔ ریاستی خزانے کو صحیح طریقے سے چلنے کی ہدایت کرے۔ حتماً معاشرے میں امن قائم کرے اور خوشحالی لائے۔ اگر وہ ان شرائط کو پورا کرتا ہے تو ان کے حوالہ سے عوام کے دو فرائض ہیں: اس کی اطاعت کریں اور کاموں کی انجام دہی میں اس کی مدد کریں۔

حضرت اقبالؒ سمجھتے تھے کہ سیاسی حاکمیت عملاً عوام کے زیر تصرف ہوتی ہے اور یہ کہ حلقۂ انتخاب (الیکٹوریٹ) متفقہ پسند کے آزادانہ اقدام کے ذریعہ اس حاکمیت کی ایک معین شخصیت کے اندر تجسیم کرتا ہے جس کی وساطت سے اجتماعی منشاء کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ اس نشستِ اقتدار کو کوئی قانون رعایت نہیں دی جاتی ماسوائے انفرادی مرضیات (Wills) پر قانونی قدغن عائد

[1] Discourses of Iqbal, p. 249

کرنے کے، جس کا وہ مظہر ہے[1]۔ علاوہ ازیں سیاسی حاکمیتِ اعلیٰ قانون کی نگاہ میں معاشرے کے تمام ارکان کی کلی مساوات کے تحت عوام سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں، کوئی پاپائیت نہیں ہے اور کوئی نظامِ ذات پات نہیں ہے۔ اسلام ایک مساواتی قوت (levelling force) ہے۔ یہ فرد کو اس کی داخلی قوت (inward power) کا احساس دلاتا ہے اور ان کو بلندی عطا کرتا ہے جو معاشرتی طور پر کمتر ہیں۔

مختصراً یہ کہ مغرب نے گروہوں کی تشکیل نو کے لیے شراکت اور صلاح و مشاورت کے اصول اختیار کئے ہیں۔ 'سنہری انقلاب' (Glorious Revolution, 1688) نے یہ طے کر دیا تھا کہ انگریز بادشاہوں کو اپنے عوام پر غیر معمولی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے اور یہ کہ عوام کا بنایا گیا قانون ہی بالاتر ہوگا۔ اس میں ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ بادشاہوں کے خدائی حقوق (Divine Rights) کا کوئی تصور نہیں اور یہ کہ حاکمیتِ اعلیٰ (sovereignty) عوام کے پاس ہوتی ہے۔ اس تصور نے مغربی معاشروں میں حکومتوں اور شہریوں کے موجودہ کردار اور حقوق کی وضاحت کی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی سیاسی تعلیمات ابھی تک عہد متوسط جیسی ہیں اور ان کی نگاہیں 'امیر' کے اختیارات پر مرتکز چلی آ رہی ہیں۔ اس سیاق و سباق میں شوریٰ (پارلیمنٹ) کو امیر کے تابع بنا دیا گیا ہے کیونکہ اس کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اسے 'امیر' خود نامزد کرتا ہے۔ جب ایک امیر ارکان شوریٰ کو نامزد کرتا ہے اور اس کے فیصلوں کا اطلاق امیر پر نہیں ہوتا۔

مسلمان تو عوام کے ساتھ واجب التعمیل مشاورت کے علمبردار ہوتے تھے لیکن اب انہوں نے کبھی ایک بہانے سے اور کبھی دوسرے بہانے سے جمہوریت یا عوام کی حکمرانی کے اس تصور کی مخالفت شروع کر دی۔ مسلمان رہنماؤں نے اپنی ساری قوتیں جمہوریت کی اصلاح کرنے کی بجائے مخالفت کرنے پر ضائع کر دیں۔ اس ماحول کی وجہ سے ٹامس ہابز، جان لاک، روسو اور مونٹیسکیو جیسے مفکرین نہ اُبھر سکے۔ مسلمانوں کی سیاسی ثقافت میں ابھی تک جاگیردارانہ،

---

[1] ibid, p. 58

اشرافیانہ یا مذہبی حکومت کے تصورات پائے جاتے ہیں جو سماوی حقوق، بادشاہت اور خاندانی حکومت پر مبنی ہیں جن میں انسانی حقوق کم ہوتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی اور دستوریت، صحیح معنوں میں نہیں ہوتی۔ اس شعبے میں ابتدائی مراحل میں بہت ترقیوں کے باوجود مسلمان اب تک پوری طرح آزاد نہیں ہوئے اور اپنی حکومتیں بناتے یا توڑتے نہیں ہیں۔ عمومی لحاظ سے مسلم دنیا میں آج کی سیاسی ثقافت زیادہ تر ویسی ہی ہے جیسے انقلاب فرانس (1779ء) سے پہلے مغرب میں ہوتی تھی۔ اس طرح ہم ان قوموں سے تقریباً 250 سال پیچھے چل رہے ہیں۔

میری عاجزانہ رائے میں قرارداد مقاصد جو 12 مارچ 1949ء کو پاکستان کی دستورساز اسمبلی نے منظور کی ایک اہم سیاسی فکری پیش قدمی ہے۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ مستقبل کا پاکستانی دستور سراسر یورپی نمونے پر نہیں بنایا جائے گا بلکہ یہ اسلام کے نظریئے اور جمہوری عقیدے پر استوار ہوگا۔ یہ قرارداد 1956ء، 1962ء اور 1973ء کے دساتیر کا دیباچہ بنی اور بالآخر آرٹیکل 2(A) کے تحت جب 1973ء کے دستور میں آٹھویں ترمیم کی 1985ء میں منظوری ہوئی تو یہ دستور پاکستان کا حصہ بن گئی۔ قرارداد مقاصد کا متن یہ ہے:

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کل کائنات کا بلاشرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمائے ہیں کیونکہ یہ اختیارِ حکمرانی ایک مقدس امانت ہے:

یہ دستورساز اسمبلی جو پاکستان کے عوام کی نمائندہ ہے، آزاد و خودمختار ریاست پاکستان کے لیے ایک دستور وضع کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہرگاہ یہ ریاست اپنے اختیارات و حاکمیت عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے بروئے کار لائے گی۔ جس کی رُو سے اصولِ جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری، عدل و حکمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا، جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر خود کو اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں متعین ہیں، تربیت دے

سکیں۔جس کی رُو سے اس امر کا واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقیدوں پر قائم رہ سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی جن میں حیثیتوں اور مواقع کی مساوات اور قانون کے مطابق معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی انصاف، آزادیِ فکر، آزادیٔ اظہار، مذہب و عقیدہ، عبادت و تنظیم سازی اور تابعِ قانون اخلاقیات کی آزادی شامل ہے۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا اور جس کی رُو سے نظام عدل کی آزادی کاملاً محفوظ ہوگی۔

جس کی رو سے عدلیہ کی آزادی کی مکمل ضمانت دی جائے گی۔ پاکستان کے عوام اقوام عالم میں باوقار مقام حاصل کر سکیں اور وہ بین الاقوامی امن و ترقی اور انسانیت کی خوشیاں بڑھانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

اس قرارداد کو اس وقت کے تمام بڑے اسلامی مفکرین کی حمایت حاصل تھی جن میں سید ابو اعلیٰ مودودیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ[۱] پیر مانکی شریفؒ[۲] اور دیگر علماء کرامؒ بھی شامل تھے۔اس قرارداد کو اب بھی علماء کرامؒ اور اہل دانش کی حمایت حاصل ہے۔ بالفاظ دیگر پاکستان کے تمام علماء اور اہل دانش نے اجتماعی اجتہاد کے ذریعے پاکستان کی قومی ریاست کے تصور کو قبول کیا ہے۔ ایک عالمگیر اسلامی خلافت عہد حاضر میں ناممکن ہے اور نہ ہی کبھی ایک عالمگیر اسلامی خلافت ممکن ہوئی ہے۔اس لیے اس محال تصور کے لیے خون نہیں بہانا چاہیے بلکہ اچھی مسلم قومی ریاستیں بنی چاہیں جن کا باہمی بین الاقوامی روحانی و سیاسی اتحاد ممکن ہوسکتا ہے۔

[۱] مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (1885ء-1949ء) ایک معروف پاکستانی اسلامی سکالر تھے جنہوں نے دار العلوم دیوبند انڈیا سے تعلیم حاصل کی۔

[۲] امین الحسنات المعروف پیر آف مانکی شریفؒ (1923ء-1960ء) شمال مغربی سرحدی صوبہ (حالیہ خیبر پختونخواہ) کے ایک مذہبی و سیاسی لیڈر تھے۔

3 معاشرتی علوم میں کمزوری

(1) علم البشریات

علم البشر یا 'بشریات' انسان کے بارے میں ایک 'نظریۂ کلیت' (totality of human) ہے یعنی ہستی انسان کی کلیّت کا علم۔ یہ شاخِ علم معاشرتی علوم، انسانی خصوصیات (humanities) اور انسانی حیاتیات (human biology) کے مختلف پہلوؤں کے انضمام (integration) کا مطالعہ کرتی ہے۔ بشریاتی معاشرتی علوم (anthropological social sciences) اکثر اشاراتی درجے کی تفصیلات تک جا پہنچتے ہیں جبکہ اس کے برعکس کیمیاء یا طبیعیات سے ماخوذ عام قوانین سے انسان کے بارے میں عمومی معلومات حاصل ہوتی ہیں یا وہ زیادہ عمومی اصولوں کے ذریعے انفرادی کیسوں میں وضاحت پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ علم نفسیات کے کئی شعبوں میں ہوتا ہے۔ علم کی یہ شاخ، جدید دنیا میں ایک بڑے شعبۂ مطالعہ کے طور پر ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ لیکن ہمیں علم کی اس شاخ میں کوئی نمایاں مسلم نام دکھائی نہیں دیتا۔ البیرونی نے مشرق وسطیٰ، بحیرۂ روم اور جنوبی ایشیا کے لوگوں، مذاہب اور ثقافتوں کی بشریات کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اس پر گرانقدر کتابیں لکھی ہیں[1]۔

ابن خلدون نے 'جمعیت شناسی' (Demography)، تاریخیائی جغرافیہ (Historiography)، فلسفۂ تاریخ (Philosophy of History)، عمرانیات (Philosophy of Sociology) اور اقتصادیات (Economics) کے شعبوں پر کافی تحقیقی مواد مرتب کیا۔ ابن خلدون کو اپنی کتاب 'مقدمہ' کی وجہ سے بہت شہرت ملی ہے۔ ابن خلدون کے بعد کسی مسلمان نے اس شعبے میں قابل ذکر کام نہیں کیا۔ مسلمان تہذیب اور موجودہ مسلمان معاشروں پر سارا کام مغربی دانشور ہی کر رہے ہیں جن کی فکر بنیادی طور پر ہماری سوچ کی ساخت سے مختلف ہے۔ وہ عام طور پر ہم سے ہمدردانہ رویہ نہیں رکھتے۔

[1] Journal of the History of Ideas 59 (3), p. 389 - 403

عہد حاضر میں علم البشریات پر سب سے زیادہ اثر آثار قدیمہ کے علم (Archeology) کی دریافتوں نے کیا ہے جس میں مسلمانوں کا کوئی بھی حصہ نہیں ہے۔ عہد حاضر کے ڈاکٹر اکبر صلاح الدین احمد (پاکستان) نے علم بشریات کے حوالہ سے مسلم معاشروں پر کچھ کام کیا ہے۔ آپ کا زیادہ تر کام پشتون قبائل، مراکش، یمن، سعودی عرب اور فلپائن کے مسلمانوں پر ہے۔

(2) علم سیاسیات

علم سیاسیات ایک تعلیمی اور تحقیقی شعبۂ علم ہے جو سیاسیات کے نظریہ اور سیاست کے طریق ہائے کار، سیاسی نظاموں اور سیاسی رویوں کی تفصیلات اور تجزیہ کا مطالعہ کرتا ہے۔

سیاسیات کے شعبے اور ذیلی شعبوں میں سیاسی معیشت، سیاسی نظریہ اور فلسفہ، شہریت (civics) اور تقابلی سیاسیات، سیاسی ارتقا، بین الاقوامی تعلقات اور عوامی پالیسی (public policy) شامل ہیں۔ سیاسیات میں بین الاقوامی تعلقات اور بڑی طاقتوں اور سپر طاقتوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ پچھلے ابواب میں مغرب اور مسلم دنیا میں سیاسی فکر کے ارتقا کی تفصیلات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مسلم دنیا میں ایک مصنف بھی ایسا نہیں جس کا سیاسی تحریروں کے حوالہ سے ٹامس ہابز، لاک یا روسو سے موازنہ کیا جا سکے۔ صرف حضرت شاہ ولی اللہؒ حضرت محمد اقبالؒ اور محمد اسدؒ[1] نے اپنے اپنے عہد میں سیاسی مسائل کا جامع، محتاط اور طریقیاتی تجزیہ (methodological analysis) کیا ہے۔ عہد جدید میں جمال الدین افغانی نے سیاسیات میں اسلام کے کردار کی بحث کو آگے بڑھایا جس کے بعد کچھ کام مصر میں علامہ رشید رضا اور شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق نے کیا۔ جس کے بعد سید قطب شہید اور پاکستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا۔ ایران میں علی شریعتی، مرتضیٰ مطہری، حسین منتظری اور روح اللہ خمینی نے کیا۔

ان علما کی تحریروں نے مسلمان دنیا پر غیر معمولی اثر ڈالا لیکن عالمی مطالعہ سیاسیات میں شاید اس کا

---

[1] Leopold Weis: محمد اسدؒ (1900ء-1992ء) ایک جرمن مسلم سکالر تھے جنہوں نے یہودی مذہب کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی دنیا کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ محمد اسد اسلامی موضوعات پر کئی تحقیقی کتب کے مصنف بھی ہیں۔

کوئی کردار نہیں ہے۔ کیونکہ ان سب قابل قدر حضرات کی سیاسی تعبیرات اسلامی تعلیمات کے دائرہ کے اندر تھیں بلکہ ان کی فی الحقیقت تشریح ہی تھی۔

(3) علم نفسیات

اسلام کے عہد زریں میں مسلمانوں نے نفسیات (Psychology) پر اچھا خاصا کام کیا جس میں ان کی زیادہ تر توجہ روح، ذہنی امراض اور فلسفہ ذہن وغیرہ پر رہی۔ جس میں زیادہ تر کام ابوبکر محمد بن زکریا الرازی اور ابن سینا نے کیا۔ الرازی نے بغداد کے ہسپتال میں نفسی ونفسیاتی امراض کا وارڈ قائم کیا۔ غالباً انسانی تاریخ میں یہ پہلا باقاعدہ وارڈ تھا۔ اس ضمن میں دو کتب المنصوری اور الھواء بہت مشہور ہیں۔ ابن سینا نے اپنی کتاب القانون فی الطب میں بے خوابی، پاگل پن، ذہن کے چکر، فالج، مرگی، ڈپریشن پر خوب بحث کی اور ان کے علاج تجویز کیے۔
عہد حاضر میں نفسیات کے مطالعہ کو علم التصوف سے منسلک سمجھا گیا ہے۔ اسے قلبی بیماریوں اور کیفیات سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جس میں کچھ صوفیائے کرامؒ نے یقیناً کام کیا ہے۔ کچھ نومسلم فلسفی صوفیوں[۱] نے بھی اچھا کام کیا ہے مگر ہم اس کا مقابلہ علم نفسیات کی اس ترقی سے نہیں کر سکتے ہیں جو عہد جدید میں مغرب میں ہوئی ہے۔ حالانکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علمائے کرام نے ماضی میں علم النفس کی پیچیدگیوں پر عظیم کام کیا ہے۔ مگر اب ولیم جیمز، فرائڈ، ایڈلر اور یونگ کا زمانہ ہے۔

(4) علم عمرانیات

علم عمرانیات جدیدیت مثلاً صنعتی ارتقاء، شہری آبادیوں پر پڑنے والے دباؤ، لادینیت اور بڑھتے ہوئے سلسلۂ توجیہات کے چیلنجز کے علمی ردعمل کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ مسلمانوں میں سے صرف ابن خلدون نے عمرانیات پر قابل قدر کام کیا۔ ابن خلدون نے اپنی کئی جلدوں پر مشتمل تاریخ کی کتاب کا ایک طویل مقدمہ (Prolegomena) لکھا جس میں انہوں نے

---

[۱] رینے گینوں (1951) فرتھ جوف شوان (1998) اور مارٹن لنگز (2005) شامل ہیں جن کی تعلیمات کو سید حسین نصر نے پھیلایا۔

انسانی سماج اور اس کے ارتقا کے بارے میں تاریخ میں پہلی بار ایک جامع اور عقلی تجزیہ پیش کیا۔ مقدمہ میں انہوں نے تاریخ میں پہلی بار علم عمرانیات کے بنیادی اصول بیان کیے جو یہ ہیں:

(i) سماجی عمل کے کچھ اپنے اصول وضوابط ہیں جن کے تحت سماج میں ایک خاص ترتیب سے خاص نتائج نکلتے ہیں۔ یہ سماجی اصول اگر چہ سائنس کے اصولوں کی طرح مطلق نہیں ہیں مگر بہت حد تک مستقل ہیں۔

(ii) سماجی قوانین عمومی طور پر عوام الناس پر اثر کرتے ہیں اور افراد ان پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکتے۔

(iii) سماجی قوانین جاننے کے لیے ہمیں بہت سے حقائق اکٹھے کرنا ہوتے ہیں۔ حالات اور ان کے نتائج کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ جس کے لیے ہمیں تاریخی ریکارڈ اور حالات حاضرہ دیکھنے پڑتے ہیں۔

(iv) سماج غیر متحرک نہیں ہے۔ سماجی اشکال بدلتی رہتی ہیں۔ مختلف لوگوں اور آبادیوں کے باہمی عمل اور معاشی ناہمواریوں سے سماج میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

(v) سماجی قوانین صرف حیاتیاتی اور جسمانی عوامل کے نتیجے نہیں ہوتے بلکہ اس میں سماجی قوتوں کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔

ابن خلدون کے سماجی نظریات میں نظریہ عصبیت (Social Solidarity) بہت اہم ہے۔ جس سے سماج میں باہمی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ قبائلی اور شہری عصبیت مختلف ہوتی ہے۔ ابن خلدون نے نظریہ عصبیت کی روشنی میں مسلم سماج کے بارے میں کہا کہ

(ا) بدوی قبائلی سماج اپنی بہتر سماجی عصبیت اور یک جہتی کی وجہ سے غیر متحرک شہری سماج پر فتح حاصل کر لیتے ہیں۔

(ب) قبائلی عصبیت اور یک جہتی کا، سخت گیر اور کتابی شہری مذہب سے امتزاج بہت طاقتور بن جاتا ہے۔

(ج) فتوحات کے بعد ترقی اور عیاشی شروع ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں حکمران طبقہ میں تنزلی شروع ہوجاتی ہے اور پھر وہ ختم ہوجاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ [۱] نے ہندوستانی معاشرے کی روشنی میں مسلم سماج پر کلام کیا۔ انہوں نے علم حیاتیات، نفسیات اور اخلاقیات کا رابطہ سماجیات سے جوڑنے کی کوشش کی۔ ارتفاقات (مفید مقاصد) کا نظریہ پیش کیا جس کی روشنی میں انہوں نے انسانی خصوصیات، سماجی ترقی کی منازل، سماجی سسٹم کے عناصر وغیرہ پر بحث کی۔ لیکن یہ ساری بحث اسلام کے نقطہ نظر کے حوالہ سے ہے۔

حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے بھی مسلم نفسیات کی ساخت اور مسلم سماج کی خصوصیات وغیرہ پر بحث کی مگر زیادہ تر یہ بات غالب رہی کہ مسلم سماج کا احیا کیسے ہوسکتا ہے۔

ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی [۲] حضرت علامہ محمد اقبالؒ سے بہت متاثر تھے اور اسلام کی انسان دوست اور ترقی پسندانہ تعبیر کرتے تھے۔ انسانی وحدت کے زبردست حامی تھے۔

4 نئے معاشی افکار سے بے خبری

آٹھویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان مسلم دنیا میں متعدد ترقی یافتہ تصورات اور تیکنیکوں نے فروغ پایا۔ ان کا تعلق پیداوار، سرمایہ کاری، مالیات، معاشی ترقی، محاصل اور املاک کے استعمال کے شعبہ جات سے تھا۔ ان پیش قدمیوں میں 'حوالہ' (قدیم طریقۂ ترسیل زر)، وقف، طریقۂ معاہدہ، جس پر تاجروں کو اعتماد ہوتا تھا، مشترکہ کرنسی کا پھیلاؤ، چیک، پرامزری نوٹس (promissory notes)، قدیم معاہدے، بلوں کا تبادلہ (مفوضہ) ترقی یافتہ زرعی طریقے، اعلیٰ شرح خواندگی اور خادموں کا بہترین استعمال شامل تھا۔

---

[۱] حضرت شاہ ولی اللہؒ (1762) دہلی کے محدث، فقیہ اور فلسفی تھے۔ ان کے والد محترم نے مشہور مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا اور وہ اورنگ زیب عالمگیر کے مذہبی مشیرے تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کے مصنفین میں شامل تھے۔ آپؒ کی کتب یہ ہیں: حجۃ البالغہ، التفہیمات

[۲] ڈاکٹر علی شریعتی مشہد ایران میں پیدا ہوئے۔ ایران اور پیرس میں تعلیم پائی۔ رضا شاہ پہلوی نے ان کو کئی بار جیل میں ڈال دیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کو ایران کی خفیہ ایجنسی نے قتل کیا۔ آپ کو ایرانی انقلاب کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

اولین معاشی مفکرین میں ایک حضرت امام ابو یوسفؒ تھے جو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے محاصل پر کتاب 'کتاب الخراج' لکھی۔ جس میں محصولات، قومی مالیات اور زرعی پیداوار کے خطوط واضح کئے گئے۔ انہوں نے املاک پر مقررہ ٹیکس کی بجائے، پیداوار پر متناسب محصول کے مسئلے پر بحث کی تاکہ زیادہ سے زیادہ رقبہ زیر کاشت لانے کے لیے اچھی ترغیبات مل سکیں۔ انہوں نے محصولات معاف کرنے کی پالیسیوں پر بھی زور دیا۔ جس سے کاشتکار کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس میں بدعنوانیاں کم کرنے کے لیے مرکزی نظامِ محاصل قائم کرنے پر بھی زور دیا گیا۔ حضرت امام ابو یوسفؒ نے محاصل کی آمدنی سے معاشرتی و اقتصادی ذیلی ڈھانچے کی تعمیر کی بھی تجویز دی۔ اس میں مختلف قسم کے محاصل بشمول سیلز ٹیکس، اموات ٹیکس اور درآمدی محصول کا بھی ذکر تھا۔

حضرت ابوعبید القاسم بن سلامؒ نے 'کتاب الاموال' لکھی جس میں اسلام کی پہلی دو صدیوں کے دوران عائد محصولات کے قانونی نظائر (precedents) کا صحیح ریکارڈ موجود تھا۔ خاص طور پر اس میں مآخذ محاصل اور سرکاری مصارف کے طور طریقے شامل تھے۔ تاہم اس کتاب کی افادیت ان طریقوں میں مضمر ہے جو مصنف نے تجویز کئے اور ان کا تجزیہ پیش کیا۔ حضرت ابو عبیدؒ نے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آراء اور ممتاز فقہاء کرامؒ کے اقوال جمع کر کے ان کا قانونی تجزیہ پیش کیا جو کہ اسلام کے قانونی ادب کا فقید المثال مجموعہ ہے۔

فارابی، ابن سینا، حضرت امام غزالیؒ، محقق طوسی، ابن خلدون اور دیگر اہل علم نے گھر، معاشروں، کارخانوں اور اقوام کے حوالوں سے تقسیم محنت (division of labour) پر شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ حضرت امام غزالیؒ نے نظریۂ مالیات پر روشنی ڈالی۔ شیخ ابن تیمیہؒ جیسے ابتدائی دور کے اہل علم و دانش طلب و رسد (supply and demand) کی قوت کا کسی حد تک ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے منڈیوں کے قواعد و ضوابط کے حوالے سے فلاح عامہ کو ملحوظ رکھنے کے فوائد اور نہ رکھنے کے نقصانات پر لکھا ہے۔

ابن خلدون نے معاشی نظریئے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ پیداوار کو فروغ اور ترقی دینے سے طلب اور رسد دونوں پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ کہ طلب و رسد کی قوتیں ہی ہیں جو اشیاء کے نرخوں کا تعین کرتی ہیں۔ اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ آبادی میں اضافے، انسانی سرمائے کے فروغ اور فنیاتی پیش قدمی کی معاشی ارتقائے کبیر کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ اس نے ایک تصور متعارف کرایا جسے 'Khaldun Laffer Curve' کہتے ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ شرح محصول اور آمدنی محاصل کے درمیان تعلق شرح محصول بڑھنے کی وجہ سے کچھ عرصے تک بڑھتا رہتا ہے لیکن پھر شرحِ محصول میں اضافہ محاصل کی آمدنی کو گھٹانا شروع کر دیتا ہے کیونکہ مسلط شدہ محصول معیشت کے پیداکاروں کے لیے اشیا پر لاگت بڑھا دیتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے معاشی و معاشرتی مسائل پر مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ وہ کارل مارکس سے بہت پہلے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ دولت کا بنیادی منبع محنت ہے۔ مزدور اور کسان کمانے والے لوگ ہیں۔ مزدور کاشتکاری کرنے والے اور دماغی محنت کرنے والے ملک کی دولت پر سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں[1]۔ مزدور کی رضامندی اس وقت تک شمار نہیں کی جاسکتی جب تک اس کی مزدوری ادا نہ کی جائے۔ محنت کے دورانیے کی ایک حد مقرر ہونی چاہیے تاکہ مزدوروں کو اتنا وقت میسر آسکے جس میں وہ اپنی اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان میں یہ قابلیت پیدا ہو سکے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کریں[2]۔ تجارت کو صرف تعاون کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ حکومت کے لیے تجارت کی ترقی و خوشحالی میں بھاری ٹیکس لگا کر رکاوٹیں ڈالنا ممنوع قرار دیا گیا ہے[3]۔ جو کاروبار و تجارت عوام کے کسی طبقے کے لیے گردشِ دولت محدود

---

[1] حجۃ البالغہ، ج:4، باب: تلاش معاش کے سلسلہ کی اصولی باتیں

[2] ایضاً

[3] ایضاً، باب: ممنوع معاملات کا بیان

کرے وہ ناپسندیدہ ہے[۱]۔

تاہم اس موضوع پر قدیم مسلم مفکرین کی بلند خیالی کے باوجود اقتصادیات پر اعلیٰ درجے کی کتابوں کا صدیوں سے فقدان چلا آرہا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں اقتصادی نظریئے پر کچھ لٹریچر لکھا گیا ہے مثلاً سید محمود طالقانی[۲] کی 'اسلام وملکیت' (Islam and Ownership)، سید محمد باقر الصدر[۳] کی 'اقتصادُنا' (Iqtisaduna)، سید ابوالحسن بنی صدر[۴] کی 'اقتصادِ توحیدی' (Touhid Economics)، حبیب اللہ پیمان[۵] کی

Some Interpretations of Property Rigthts

Capital and Labor from Islamic Perspective

اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی 'اسلامی معاشیات' ہے جن کے کام کو پروفیسر خورشید احمد نے کچھ آگے بڑھایا ہے۔

عہد حاضر کی اسلامی معاشی فکر میں ایک مسئلہ ماسوائے سید قطبؒ کے عمومی طور پر غائب ہے۔ یہ زرعی اصلاحات کا مسئلہ ہے۔ زرعی اصلاحات کی مخالفت نے اسلام پسندوں کی بغاوت میں بھی کردار ادا کیا (ایران، 1963ء اور افغانستان 1978ء)۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے

---

[۱] ایضاً، باب: الرسوم السائرہ

[۲] Mahmoud Taleghani: محمود طالقانی (1911ء- 1979ء) ایک ایرانی شیعہ ماہر اقتصادیات، ماہر دینیات، اصلاح کار، جمہوریت کا وکیل اور سنئیر صحافی تھا۔

[۳] Muhammad Baqir al-Sadr: محمد باقر الصدر (1935ء-1980ء) ایک عراقی شیعہ ماہر اقتصادیات، عالم، فلسفی اور حزب دعوت اسلامی کا بانی تھا۔

[۴] Seyyed Abolhassan Banisadr؛ سید ابوالحسن بنی صدر (1933ء- حیات) ایک ایرانی ماہر اقتصادیات اور ایرانی انقلاب 1979ء کے بعد پہلا صدر تھا۔

[۵] Habibollah Peyman: حبیب اللہ پیمان (1935ء- حیات) ایک ایرانی ماہر اقتصادیات اور سیاست دان ہے جس نے ایران میں ایک اسلامک پولیٹیکل سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔

1972ء اور 1977ء کی زرعی اصلاحات (لینڈ ریفارمز) کو غیر اسلامی قرار دے دیا تھا[۱]۔
مسلم دنیا میں اقتصادیات پر لٹریچر کے اس جائزے سے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقتصادیات پر ہونے والا تقریباً سارا کام اقتصادی نظریئے (تھیوری) سے تعلق رکھتا ہے۔ اقتصادیات پر بطور سائنس ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ جب کہ مغربی دنیا میں پچھلی تین صدیوں میں اس موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ مزید برآں اس موضوع پر علمی بحث و مکالمہ کے فقدان کے علاوہ مسلمانوں نے زرعی اصلاحات کا رجعت پذیر نقطۂ نظر اپنا لیا ہے باوجود اس امر کے کہ ایک ملک کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لیے یہ بہت لازمی ضرورت ہیں۔
ایک شعبہ جس میں اقتصادیات کو اسلام کے تابع بنانے پر زیادہ بحث مباحثہ ہوا وہ جدید بنکاری ہے۔ تاہم مسلمانوں نے سود کی ممانعت کے لیے تاحال کسی ایک تعریف یا اس کے متبادل پر اتفاق نہیں کیا۔ اسلامی مالیات اور بنکاری کے طریق ہائے کار تکلیف دہ اور گراں محسوس ہوتے ہیں۔ اب تک جو کچھ ہو سکا ہے وہ زیادہ تر محض عذر (mere justifications) ہیں۔ ان میں کسی قسم کی جدت یا اختراع (innovative) سامنے نہیں آسکی اور اس پر بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔
اس طرح جدید معاشیات کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن میں زیادہ تر کاروبار ہوتا ہے۔ جیسا کہ بین الاقوامی تجارت، سٹاک ایکس چینج، بانڈز، کرنسی کا کاروبار، ڈیجیٹل معیشت، چھوٹے قرضے، ٹیکس، بین الاقوامی امداد اور ریاستی مداخلت وغیرہ۔ ان معاملات میں اسلامی معیشت کے حوالے سے کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ چونکہ زیادہ تر سود کے معاملات ہیں جن کا مناسب حل اسلامی معیشت کے حوالے سے نہیں نکالا جا سکا۔ مثال کے طور پر اسلامی بنکاری کے معاملات میں تاخیر بھی ہوتی ہے اور شرح منافع بھی زیادہ ہے۔ اس لیے مسلمان ممالک بھی اس بنکاری نظام کو مکمل طور پر اپنانے میں ہچکچا رہے ہیں۔ یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر اس

---

۱ مظفر علی قزلباش کیس 1989ء، سپریم کورٹ (شریعت اپیلٹ بنچ)

موضوع پر کام شروع ہوا جو کہ اب کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔مثال کے طور پر اس وقت پوری دنیا کے بنکنگ نظام میں اسلامی بنکنگ کا حصہ صرف 1٪ (ایک فیصد) ہے۔

تاہم اس عہد میں پروفیسر خورشید احمد (پاکستان) ڈاکٹر عمر چھاپرا (پاکستان) مفتی تقی عثمانیؒ (پاکستان) اورڈاکٹر نجات اللہ صدیقی (انڈیا) نے اسلامی معیشت کے تصورات کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن ادب کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بھی کوئی ایسا سسٹم دینے میں کامیاب نہیں ہوئے جو سب علما کو قبول ہو اور مفید بھی ہو۔

5 نئے اصول قانون سے بے اعتنائی

آیئے دیکھتے ہیں کہ دورِ متأخر میں ارتقائے قانون کے لیے مسلمانوں نے کیا کیا۔ہم اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے اوائل کی تاریخ میں فقہ اور قانون کے ارتقاء کے لیے بہت کام کیا تھا[۱] تاہم جدید دور میں قانون کی ترقی کے لیے مسلمانوں نے بالکل کوئی کردار ادا نہیں کیا۔حضرت امام شافعیؒ کے بعد صرف دو اہل علم و دانش شخصیات تھیں جنھوں نے اصول قانون (اصول فقہ) کو ترقی سے ہمکنار کیا: حضرت امام شاطبی[۲] جنھوں نے 'الموافقات فی اصول الشرعیۃ' (بنیادی اسلامی قانون میں آہنگی) لکھی اور شیخ ابن تیمیہؒ نے 'السیاسۃ الشرعیۃ' (اسلامی قانون کی حکمت عملی) لکھی۔تاہم ان کی یہ خدمات ان ذہنی کاوشوں اور ترقیوں کے مقابلے میں پھیکی پڑ جاتی ہیں جو انہی کے زمانے کے بعد مغرب میں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔

آپ نے پچھلے باب میں دیکھا ہے کہ مغرب میں قانون اور خاص طور پر فلسفہ قانون/ اصول قانون (اصول فقہ) میں کتنی ترقی ہو گئی ہے۔جبکہ مسلم دنیا ابھی تک اس ضمن میں سوئی ہوئی ہے۔

---

[۱] دیکھیے باب 4

[۲] ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد اللخمی الشاطبیؒ (1320ء-1388ء) ایک مشہور محدث، فقیہ، لغوی اور جامع العلوم تھے جنہیں مجددین اسلام میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ مالکی المسلک تھے۔آپؒ کی تفسیر شاطبیؒ کا شمار قرآن پاک کی شاہکار تفاسیر میں ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر:

(1) بین الاقوامی قانون اپنی اعلیٰ حدوں کو چھو چکا ہے۔ بہت سے بین الاقوامی ادارے بن چکے ہیں جو نہ صرف نظریاتی کام کررہے ہیں بلکہ بین الاقوامیت تشکیل دے رہے ہیں اور اس پر عمل بھی کروارہے ہیں۔ اسلامی قانون کے حوالے سے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ماضی میں حضرت امام محمد شیبانیؒ اور امام زیدؒ کے کام ملتے ہیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ عہد حاضر میں ڈاکٹر حمید اللہ، محمود احمد غازی اور وہبہ ذوہیلی نے پرانی تصنیفات کی کچھ نئی تشریحیں کی ہیں۔

(2) فلسفہ قانون/ اصول قانون میں ہمارے ہاں امام شاطبیؒ بعد کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا حالانکہ کانٹ، بینتھم، آسٹن وغیرہ نے فلسفہ پر بہت اثر ڈالا لیکن ہماری طرف سے اس ضمن میں کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ فلسفہ قانون میں اثبات پسندی (Positivism) نے بہت اثر ڈالا ہے۔

(3) آج کل کا عہد قانون کی تدوین کا زمانہ ہے۔ اسلامی قانون مدون شکل میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ بہت حد تک نصابی کتب یا فتاویٰ کی شکل میں ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ برصغیر میں مسلم پرسنل لاء میں جو کتاب بطور حوالہ استعمال ہوتی ہے، اس کا مصنف/ مؤلف ایک پارسی (F. D. Mulla) ہے۔ کسی مسلمان کو یہ توفیق نہیں ہوسکی کہ ان اسلامی قوانین کو ہی مدون کردے جو یہاں لاگو ہیں۔ یاد رہے نکاح، طلاق، مہر، وقف وغیرہ کے اسلامی قوانین پاکستان میں لاگو ہیں۔ ہمیں مسلمہ قانون اجتہاد چاہیے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اس ضمن میں صحیح فرمایا ہے: آج اسلام کو سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے۔ جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کی موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں (اقبالؒ) اور شاہ صاحب (انور شاہ کشمیری) دونوں مل کر کرسکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہوسکے[1]۔

---

[1] حیات انور، ص:165، 166

6 حقوقِ انسانی سے بیزاری

اسلام اپنے آغاز سے ہی انسانی حقوق کا علمبردار رہا ہے۔ احترام انسانیت کے جس تصور کا اعلان حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری حج، حجۃ الوداع کے خطاب میں فرمایا۔ اسلام کے قرونِ اولیٰ سے ہی تحریک حقوقِ انسانی کا رہنما اصول رہا ہے اور اس وقت اسی نے اسلام کو باقی دنیا سے ممیز کر دیا تھا۔ تاہم جدید دنیا میں وسیع مسلم آبادی نے انسانی حقوق کے تصور کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد کے زمانے میں صرف چند ایک مصنفین نے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی طرح اس موضوع پر زورِ قلم دکھایا ہے۔ عصر حاضر کے بیشتر مسلمان انسانی حقوق کو مغرب کا سیاسی ایجنڈا سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں مغربی قوتوں نے اپنی خارجہ پالیسی کے آلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مسلم ریاستوں کے معاملات میں انسانی حقوق کا کوئی کلچر نہیں رہا۔ اگرچہ بعض دساتیر میں پاکستان کے دستور کی طرح بنیادی حقوق کے بہت مفصل ابواب موجود ہیں۔

بالآخر اسلامی کانفرنس کی تنظیم نے 1990ء میں اپنے قاہرہ (مصر) کے اجلاس میں اعلانِ قاہرہ برائے انسانی حقوق (Cairo Declaration on Human Rights in Islam) جاری کیا۔ یہ اعلان انسانی حقوق سے متعلق اسلامی نقشہ فراہم کرتا اور اس امر کی توثیق کرتا ہے کہ اسلامی شریعت ان حقوق کا واحد منبع ہے۔ 'Cairo Declaration on Human Rights in Islam' انسانی حقوق کے میدان میں اپنے ارکان (OIC) کی عمومی رہنمائی کے لیے اپنے نصب العین کا اعلان کرتا ہے۔ اس کو 1948ء میں جاری کردہ عالمی حقوق انسانی کے دستور پر ردِ عمل کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ یہ اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ UDHR کی قسم کے دیگر بہت سے حقوق کو بھی بیک وقت اسلامی روایات کے مطابق آگے بڑھایا جائے گا۔

باوجود اس طرح کی ایک ترقی پسندانہ تحریک کے، مسلم دنیا اب بھی خوفناک حد تک پیچھے ہے جو اس شعبے میں تحقیق اور انسانی حقوق پر عمل درآمد کی کوتاہی کی غمازی کرتی ہے۔ انسانی حقوق کی تحریک دنیا بھر میں پھیل کر ایک عالمگیر نصب العین بن چکی ہے لیکن ہم مسلمان عہد متوسط میں

پھنسے ہوئے ذہنی رجحان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہمارے حکمران اپنے عوام کے ساتھ 'شہری' (citizens) کی بجائے اپنی 'رعایا' جیسا سلوک کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں قانون کی حکمرانی کا کوئی تصور نہیں بلکہ قانون کی خلاف ورزی وقار اور اقتدار کی علامت بن چکی ہے۔

جمہوریت اور انسانی حقوق نے بنی نوع انسان کو بہت سی بیڑیوں سے آزاد کر دیا ہے۔ جس سے انسان کی غیر محدود امکانی قوت اور صلاحیت کے بند ٹوٹ گئے ہیں۔ اس کی تخلیقی قوتوں کو استعمال کر کے حالات کو بہتر بنایا جا رہا ہے اور ان سے انسانی فلاح و بہبود کے بہت سے کام لیے جا رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے صنعتی انقلاب برپا کر کے عوام کو غیر معمولی انسانی اور اقتصادی ترقی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ نئے ذرائع مواصلات (communication) نے عالمی تجارت کو بے پناہ فروغ دیا ہے۔ قانون کی حکمرانی اور بینکنگ آپریشنز نے ہر شعبے کو فقید المثال اقتصادی ترقی دی ہے۔ ان حالات میں حقوق انسانی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے تاکہ انسان مکمل طور پر اس معاشی اور سائنسی ترقی سے بھرپور فائدہ اٹھا سکے اور زندگی کو آسان تر اور خوش تر بنا سکے۔ لیکن مسلمان ملکوں میں ایسا نہیں ہے۔ بہت سے مسلمان ممالک نے حقوق انسانی کے بین الاقوامی معاہدے ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی اور امداد کے دباؤ میں کیے ہیں اور اپنی خوشی سے نہیں۔

یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ کیا ان بین الاقوامی حقوق انسانی کی روشنی میں ہمیں اپنی کچھ فقہی آراء تبدیل کرنا ہوں گی؟ مثال کے طور پر عہد حاضر میں چوری کی سزا کے لیے ہاتھ کاٹنا ان معاہدوں کی روشنی میں ممکن نہیں ہے تو کیا ہم اس کو تبدیل کریں گے جس کو ہم نے آج تک اللہ کی حد کہا ہے؟

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے[1]

---

[1] بانگ درا

6

ہمارا مذہبی نظام تعلیم

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ[۱].

(اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ!)

ہماری مذہبی تعلیم کا نظام نہ صرف اصلاح کا متقاضی ہے بلکہ یہ زیادہ اضافے کر دیئے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے نصابات اور تدریس کے طریقے فوری توجہ اور اصلاح کے محتاج ہیں لیکن ہم مسلمان اس مسئلے کے بارے میں بہت ہی حساس واقع ہوئے ہیں۔ میں شروع میں ہی یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں مدارس کا ایک وکیل اور ان کا حامی ہوں۔ ہمیں تمام مذہبی علوم انہی مدارس کے ذریعے منتقل ہوئے ہیں۔ یہ لاکھوں غریب و نادار طلبا کو مفت تعلیم دیتے ہیں جو ریاستی تعلیمی نظام سے باہر رہ گئے ہوئے ہیں۔ علماء، اسلام کے لیے ہمیشہ تقویت کا منبع رہے ہیں اور وہ مسلم دنیا کی شاندار روایات قائم کرنے کے لیے انتہائی نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب حالات و واقعات بہت بدل چکے ہیں۔ ہمیں وقت کا ساتھ دینے کے لیے اپنے اندر تبدیلیاں لانی پڑیں گی۔ اس سیاق و سباق میں غور وفکر کے لیے ذیل میں چند تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔

1 پرانے نصاب کی تبدیلی

مدارس نے ایک مفصل نصابِ تعلیم مقرر کر رکھا ہے مگر اس نصاب کی تقریباً ساری کتابیں صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں۔ مثال کے طور پر مدارس ایک خاص قسم کی منطق کی کتاب پڑھاتے ہیں جو دو ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے۔ وہ اب بھی ارسطو کی کاوشوں پر مبنی منطق پڑھا رہے ہیں۔ بلاشبہ وہ اپنے دور کی انتہائی ترقی یافتہ منطق تھی لیکن اب اس کی افادیت باقی نہیں رہی کیونکہ جدید فلسفے

[۱] سورۃ البقرۃ، آیت:31

میں ڈیکارٹ کی تصانیف کی وجہ سے بہت کچھ ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ پچھلے پانچ سو برسوں میں انسانی علوم نے بہت ترقی کی ہے لیکن ہم ذہنی تعطل کا شکار ہیں۔ افکار کے اس تعطل میں سے نکلنے کے لیے نئی علمی کاوشوں اور پیش رفتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدارس میں منطق کی جو کتب پڑھائی جارہی ہیں وہ کئی صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں جب کہ یہ مضمون بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ مدارس میں اقلیدس کی ریاضی پڑھائی جارہی ہے۔ وہ واقعی ایک عظیم ریاضی دان تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے گزرا ہے۔ اس کا جدید بیانیہ یا ایک جدید ریاضی اقلیدس کے اصولوں کی ارتقائی صورت ہے جو آج کل پاکستان میں انٹرمیڈیٹ کی سطح پر پڑھائی جاتی ہے۔ آج کے طلبا انٹرمیڈیٹ کی تعلیم مکمل کر کے انجینئرنگ کالجوں میں داخلے لے رہے ہیں لیکن مدارس کے طلبا جنہوں نے اقلیدس کی ریاضی پڑھی وہ ان داخلوں کے لیے مطلوبہ اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے رہ جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ انٹرمیڈیٹ کی سطح کی ریاضی میں اس شعبے میں ہونے والی جدید پیش رفتوں کو شامل کرلیا گیا ہے لیکن مدارس نے اس نصاب میں نہ کچھ شامل کیا ہے اور نہ کوئی تبدیلی متعارف کروائی ہے اور وہی ریاضی پڑھا رہے ہیں جو تیئیس سو (2300) سال پہلے رائج تھی۔ ادب کے معاملہ میں بھی یہی صورت حال ہے۔ مدارس میں جو ادب پڑھایا جاتا ہے، اس میں سے زیادہ تر زمانہ قبل از اسلام اور عباسی دور (750ء - 1258ء) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نصاب میں نشاۃ ثانیہ، عہد وکٹوریہ یا دورِ حاضر کی کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر مدارس کے طلباء امیر خسروؒ[۱] اور ولی دکنیؒ[۲] کو تو پڑھتے ہیں مگر مرزا غالب حضرت اقبالؒ اور فیض احمد فیض سے واقف نہیں ہیں۔ عالمی ادب کے سیاق وسباق میں یہ طلباء ہومر[۳] اور سوفوکلیز[۴] کو پڑھتے

---

[۱] امیر خسروؒ (1253ء-1325ء) فارسی اور اردو کے صوفی شاعر اور ماہر موسیقی تھے۔

[۲] ولی محمد ولی دکنی (1667ء-1707ء) برصغیر پاک وہند کے کلاسیکل اردو کے شاعر تھے۔

[۳] Homer: ہومر (800BC) ایک قدیم یونانی شاعر تھا۔

[۴] Sophocles: سوفوکلیز (406BC-497BC) ایک قدیم یونانی مصنف اور شاعر تھا۔

ہیں لیکن چاسر[1] شیکسپیئر[2]، ورڈز ورتھ[3]، جوناتھن سوفٹ[4]، جان کیٹس، چارلس ڈکنز[5] ٹی ایس ایلیٹ[6] کو نہیں پڑھتے۔

اسی طرح مدارس کے نصاب میں یونانی عہد کے بطلیموس کی فلکیات پڑھائی جاتی ہے۔ کاپرنیکس، گیلیلیو اور نیوٹن کے انکشافات نے زمین اور کائنات کے بارے میں بنیادی تصورات ہی تبدیل کر دیئے ہیں۔ ان کے انکشافات سے قبل سائنس دانوں کا نظریہ تھا کہ زمین اس پوری کائنات کا مرکز ہے۔ جب کہ آج ہم جانتے ہیں کہ سورج نظام شمسی کے مرکز میں ہے۔ کائنات کے مرکز میں نہیں۔ مسلمان اب بھی دو ہزار سال پہلے والے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے مسلمانوں میں سے بعض کو یہ یقین نہیں آتا کہ انسان نے چاند تک رسائی حاصل کر لی ہے کیونکہ پرانی نظریات کے مطابق یہ چوتھے آسمان میں ہے اور آسمانوں میں سے کوئی بھی نہیں گزر سکتا۔

دینی مدارس کا موجودہ نصاب، درس نظامی[7] جو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان اور دنیا کے دیگر حصوں مثلاً جنوبی افریقہ، کینیڈا، امریکہ، کریبین جزائر اور برطانیہ میں پڑھایا جاتا ہے۔

---

[1] Geoffrey Chaucer: جیوفرے چاسر (1340ء - 1400ء) ایک عظیم برطانوی شاعر تھا جسے انگریزی شاعری کا باوائے آدم کہا جاتا ہے۔

[2] William Shakespeare: ولیم شیکسپیئر (1564ء - 1616ء) ایک انگریز مصنف اور شاعر تھا جسے انگریزی زبان میں دنیا کے عظیم ترین مصنفین اور ڈرامہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شیکسپیئر کو انگلستان کا قومی شاعر مانا جاتا ہے۔

[3] William Wordsworth: ولیم ورڈز ورتھ (1770ء - 1850ء) ایک مشہور برطانوی رومانوی شاعر تھا۔ اسے ملک الشعرا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

[4] Jonathan Swift: جوناتھن سوفٹ (1167ء - 1745ء) ایک اینگلو آئرش سیاست دان اور شاعر تھا۔

[5] Charles Dickens: چارلس ڈکنز (1812ء - 1870ء) برطانیہ کا مشہور ناول نویس تھا۔

[6] T.S. Eliot: ٹی ایس ایلیٹ (1888ء - 1965ء) ایک مشہور انگریزی شاعر، ادیب، ڈرامہ نویس، ایڈیٹر اور پروفیسر تھا جسے 1948ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔

[7] یہ نصاب ملا نظام الدینؒ (1677ء - 1748ء) نے ترتیب دیا تھا جو انہی کی نسبت سے درس نظامی کہلانے لگا۔ ملا نظام الدینؒ فاضل جید، عارف فنون رسمیہ، ماہر علوم نقلیہ وعقلیہ اور فقیہ اصولی تھے۔

اس کے مرتب ملا نظام الدینؒ تھے۔ جو لکھنؤ (بھارت) کے شہر سہالی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب صحابی حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا۔ ملا نظام الدینؒ 1748ء میں وفات پا گئے۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہم عصر تھے۔ ان کا 'مدرسہ سہالی' بعد میں ترقی کر کے مدرسۂ فرنگی محل[1] کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے ہندوستان کی تعلیمی اور سیاسی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

ملاّ نظام الدینؒ نے اس وقت مروج مذہبی تعلیم کی اعلیٰ کتب کو منتخب کیا اور درس نظامی میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ درسِ نظامی کے نصاب میں عقلی (استدلالی) اور نقلی (مروّج منقول نصابی) علوم کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے یہ دلیل دی کہ مختلف عوامل مثلاً نوآبادیاتی نظام کے ظہور اور لادینیت کے عروج کی وجہ سے قرآن وسنت کی طرف رجوع بے حد ضروری ہے۔ تاہم موجودہ درس نظامی میں خصوصی طور پر 'نقلی' (روایتی متنی) علوم پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ مثلاً 'تفسیر' (شرح، قرآن مجید)، حدیث، علوم القرآن، تجوید[2]، عقیدہ، فقہ، عربی زبان وادب۔ تاہم یہ دعویٰ پوری طرح درست نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت سی منطق، فلسفہ اور کلام (Scholasticism) بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ مختلف اوقات میں اس نصاب میں کچھ نئی کتابیں شامل کی گئی ہیں اور کچھ اس سے نکال لی گئی ہیں۔ مختلف مکاتب فکر نے اپنے خاص نقطہ نظر سے اس نصاب میں تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ ذیل میں ہم مختلف موضوعات پر کچھ اہم کتابوں کے نام جو معمولی سے ردوبدل کے ساتھ اس نظام کا حصہ بنائی گئی ہیں مختصراً بتا رہے ہیں۔ اس میں

---

[1] فرنگی محل لکھنؤ میں وکٹوریہ روڈ اور چوک کے درمیان واقع ہے۔ اس عظیم الشان یادگار عمارت کا پہلا مالک ایک فرانسیسی تاجر نیل (Neil) تھا۔ جب مغل شہنشاہ نے فرانسیسی تاجروں کو ہندوستان سے نکالا تو اس محل کو ضبط کر لیا۔ اسی لیے یہ محل، فرنگی محل کہلانے لگا۔ اس دور کے ایک ممتاز عالم دین ملا قطب الدینؒ کو 1692ء میں زمین کے تنازعے میں قتل کر دیا گیا تو مغل بادشاہ اورنگزیب نے اظہار ہمدردی اور دلجوئی کے لیے اس کے چار بیٹوں کو لکھنو کا یہ ضبط شدہ محل اور اس سے ملحق اراضی دے دی۔ اس نسبت سے یہ خاندان بھی فرنگی محلی مشہور ہو گیا۔

[2] قرآن مجید کی تلاوت میں حروف کی صحیح ادائی کے اصول وقواعد کو تجوید کہا جاتا ہے۔

مصنفین کے نام اوران کی وفات کی تاریخیں بھی شامل کردی ہیں:

تفسیر قرآن مجید

حضرت جلال الدین سیوطیؒ (1459ء) کی تفسیر جلالین، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (1762ء) کی الفوز الکبیر، حضرت عبداللہ بن احمد نسفیؒ (1310ء) کی مدارک التنزیل اور حضرت ناصر الدین بیضاویؒ (1266ء) کی انوار التنزیل وغیرہ۔

ہر تفسیر اپنے زمانے کے حساب سے تعبیر ہوتی ہے۔اب تفسیر جلالین کو چھ سو سال گزر گئے ہیں۔ عہد حاضر کے علما نے بہت شاندار تفاسیر لکھی ہیں۔ہمیں ان کو بھی پڑھانا چاہیے۔عہد حاضر میں ہم ان تفاسیر سے استفادہ کر سکتے ہیں:

سید ابواعلیٰ مودودیؒ (1979ء) کی تفہیم القرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ (1997ء) کی تدبر قرآن، مولانا وحید الدین خانؒ (2021ء) کی تذکیر القرآن، مفتی محمد شفیعؒ (1976ء) کی معارف القرآن، پیر کرم شاہ الازہریؒ (1998ء) کی ضیاء القرآن اور سید صفدر حسین نجفیؒ (1989ء) کی تفسیر نمونہ

اس کے ساتھ انگریزی زبان میں یہ دو تفاسیر بہت اہم ہیں:

1۔ The Message of Quran M. Asad

2. The Study Quran Seyyed Hossein Nasr

یہ تفسیر قدیم تفاسیر کا مرقع ہے جسے سید حسین نصر کی قیادت میں چار نومسلم امریکی پروفیسر نے تیار کیا ہے۔اس کے علاوہ علوم القرآن پر درج ذیل کتب نہایت اہم ہیں:

علوم القرآن

امام جلال الدین سیوطیؒ (1505ء) کی الاتقان فی علوم القرآن اور ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی (2017ء) کی تاریخ تدوین القرآن الکریم

حدیث شریف

حضرت امام ولی الدین محمد بن عبداللہؒ (1341ء) کی مشکوٰۃ المصابیح، حضرت الحافظ ابن حجر عسقلانیؒ (1448ء) کی شرح نخبۃ الفکر، حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ (1462ء) کا مقدمہ شیخ عبدالحق، حضرت امام اسماعیل بخاریؒ (869ء) کی صحیح بخاری، حضرت امام مسلم قشیریؒ (874ء) کی صحیح مسلم، حضرت امام محمد عیسیٰ ترمذیؒ (892ء) کی جامع ترمذی، حضرت امام سلیمان سجستانیؒ (886ء) کی سنن ابی داؤد، حضرت امام احمد بن نسائیؒ (915ء) کی سنن نسائی، حضرت امام محمد قزوینیؒ (886ء) کی سنن ابن ماجہ، حضرت امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاویؒ (933ء) کی شرح معانی الآثار، حضرت امام محمد عیسیٰ ترمذیؒ (892ء) کی شمائل ترمذی، حضرت امام مالکؒ (795ء) کی مؤطا امام مالک، حضرت امام محمد بن حسن الشیبانیؒ (804ء) کی مؤطا امام محمد اور حضرت امام احمد بن شعیب نسائیؒ (915ء) کی سنن الصغریٰ۔

عہد حاضر میں حدیث شریف پر بہت علمی کام ہوا ہے۔ مغربی علما نے بہت علمی تنقید کی ہے۔ مسلمان علماء نے بھی کچھ تحقیق کی ہے۔ ہمیں یہ سب کچھ بھی پڑھانا چاہیے۔ خاص طور پر حدیث شریف پر مغربی مفکرین کے اعتراضات کو پڑھانا چاہیے اور ان کا جوابات پڑھانا چاہیے۔ اس سلسلے میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے:

علوم الحدیث

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی (2017ء) کی دراسات فی الحدیث النبوی وتاریخ تدوینہ، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی (2017ء) کی منہج النقد عند المحدثین-نشاۃ-تاریخہ اور حاجی محمد شفیق کی علوم الحدیث۔

فلسفہ/منطق (Logic/Philosophy)

حضرت مولانا فضل امام خیر آبادیؒ (1829ء) کی مرقاۃ فی علم المنطق، حضرت علامہ عبداللہ یزدیؒ (1606ء) کی شرح تہذیب، حضرت قطب الدین رازیؒ (1364ء) کی قطبی، حضرت

میر سید شریف جرجانیؒ (1413ء) کی کبریٰ، حضرت اثیر الدینؒ (1261ء) کی ہدایۃ الحکمت، حضرت فضل حق خیر آبادیؒ (1861ء) کی ھدیۃ السیدیۃ، حضرت حمد اللہ سندیلویؒ (19ویں صدی) کی حمد اللہ (شرح سلم العلوم)، حضرت نجم الدین قزوینیؒ (1099ء) الشماسیہ، حضرت قطب الدین ریازیؒ (1364ء) کی القتبیہ، حضرت تفتازانیؒ (1487ء) کی التہذیب، حضرت ملا حسن غلام مصطفیٰؒ (1794ء) کی سلم العلوم لملاّ حسن، حضرت محمد فاروقیؒ (1409ء) کی شرح شمس البازعہ اور حضرت عبداللہ گنگوہیؒ (1921ء) کی تیسیر المنطق۔

یہ پرانا فلسفہ ہے جو دنیا میں ختم ہو چکا ہے۔ اس کو صرف اور صرف پس منظر کے طور پر پڑھایا جانا چاہیے اور عہد حاضر کے فلسفہ کو پڑھانا چاہیے جس کے موضوعات اب وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔ مثال کے طور پر اب حادث اور قدیم اور وجود کی بحثیں نہیں رہیں بلکہ لایعنی ہو گئی ہیں مگر پس منظر کے طور پر درست ہیں۔ ہمیں جدید فلسفہ اور منطق پڑھانی چاہیے اور ان کتب میں کمی کرنی چاہیے اور اس سلسلے میں تجویز ہے کہ ہمیں برٹرینڈ رسل کی مغربی فلسفہ کی تاریخ اور ول ڈورانٹ کی فلسفہ کی کہانی پڑھانی چاہیے۔ لطفی جمعہ کی فلسفہ اسلام، شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ البالغہ اور خطبات اقبال بھی پڑھانے چاہییں۔ اس طرح سیاسی فلسفہ اور جدید معاشی افکار بھی پڑھانا چاہییں۔

فلکیات (Astronomy)

محمود خوارزمی (تیرہویں صدی عیسوی) کی الملخص فی الحیایہ، موسیٰ محمود روحی (1436ء) کی شرح قاضی، بہاء الدین آمولی (1620ء) کی تصریح الافلاک اور لطف اللہ مہندی (1732ء) کی شرح التصریح۔

یہ کتب اپنے زمانے کی عظیم کتب تھیں مگر اب دوربین اور ریاضی کی ترقی کے بعد علم الفلکیات مکمل طور پر تبدیل ہو گیا ہے۔ پہلے زمین کو نظام شمسی کا مرکز مانا جاتا ہے اور اب سورج کو مرکز مانا جاتا ہے۔ ان میں کوئی ایک کتاب بھی مفید نہیں ہے۔ کسی بھی اچھی یونیورسٹی کے بی اے کے سلیبس کی کتاب پڑھا دینی چاہیے۔

فقہ

حضرت امام ابوالحسن احمد بن محمدؒ (907ء) کی مختصر القدوری، حضرت عبید اللہ ابن مسعود محبوبی حنفیؒ (1346ء) کی شرح وقایہ، حضرت علامہ نظام الدین شاشیؒ (936ء) کی اصول الشاشی، حضرت برہان الدین مرغینانیؒ (1196ء) کی ہدایہ، حضرت شیخ احمد المعروف ملا جیونؒ (1718ء) کی نور الانوار، حضرت شیخ حسن بن علیؒ (1688ء) کی نور الایضاح، حضرت ملا حسن فرنگی محلیؒ (18 صدی) کی شرح بر مسلم الثبوت، حضرت محب اللہ بہاریؒ (1707ء) کی مسلم الثبوت، حضرت علی مرغینانیؒ (1196ء) کی البدایہ شرح الہدایہ، حضرت احمد نسفیؒ (710ء) کی کنز الدقائق اور حضرت شیخ سراج الدین محمد (1311ء) کی سراجی۔

ان کتب میں آخری کتاب بھی ساڑھے تین سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس طرح آپ عہد حاضر کے مسائل سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ نہ صرف سماجی فکر میں تبدیلی آئی ہے بلکہ بالکل نئے علوم آ گئے ہیں۔ مگر ہم وہیں کے وہیں ہیں۔ نئے عملی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کے بارے میں ہم اپنے بچوں کو بالکل ہی نہیں پڑھا رہے۔ عہد حاضر میں ہمارے علما نے بہت فقیہانہ کام کیا ہے۔ بہت اعلیٰ اور عمدہ تحقیق کی ہے۔ اس کو بھی شامل نصاب ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں وھبہ زوہیلیؒ، ہاشم کمالیؒ، عبدالرحیم انصاریؒ، مفتی محمد عبدہؒ، محمد رشید رضاؒ، یوسف قرضاویؒ، سید ابو اعلیٰ مودودیؒ، امام شاطبیؒ، ڈاکٹر محمد خالد مسعود اور سید امیر علی کی تصنیفات کے ساتھ ساتھ موسوعہ فقہیہ کویت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ادب (Literature)

محمد اعزاز علی (1954ء) کی نفحۃ العرب، ابو محمد القاسم حریری (1122ء) کی مقاماتِ حریری، ابوالطیب احمد ابن حسین متنبّی کندی (965ء) کی دیوان متنبی، حبیب بن اوس طائی (845ء) کی دیوانِ حماسہ، بدیع الزمان حمدانی (1007ء) کی مقامات البدیع، احمد شیروانی (1320ء) کی نفحۃ الیمان، حماد الروایۃ (771ء) کی المعلقات السبع اور مسعود بن عمر تفتازانی

(1390ء) کی مختصر المعانی۔
نثر و نظم ترقی کرتی رہتی ہے جبکہ ہم نو سو سال پہلے کا ادب پڑھا رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان قدیم کتب کے کچھ حصے پڑھا لیں اور جدید عربی ادب لازمی طور پر نصاب میں شامل کریں۔ زبان زندہ ہوتی ہے۔ بدلتی رہتی ہے مگر ہم ماضی میں قید ہیں۔ ہمیں جدید عربی، فارسی اور اردو ادب بھی پڑھانا چاہیے۔ فارسی میں سعدی، حافظ، فردوسی، بیدل، رومی اور اقبال کو پڑھانا لازم ہے۔ اس طرح اردو میں غالب، اقبال، میر، فیض احمد فیض کو بھی پڑھانا چاہیے۔ عالمی ادب میں سے ٹالسٹائی، دوستوئیفسکی، وکٹر ہیوگو، شکسپیئر، چارلس ڈکنز اور ورڈورتھ کو بھی پڑھانا چاہیے۔

ریاضی (Mathematics)

بہاء الدین آمولی (1620ء) کی خلاصہ فی الحساب اور نصیر الدین طوسی (1273ء) کی تحریر اقلیدسی۔
یہ کتابیں بھی عہد حاضر کی ریاضی کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہیں۔ علم ریاضی نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اب کمپیوٹر نے معاملے کو بہت آگے پڑھا دیا ہے۔ ہمیں مدارس میں اب میٹرک یا ایف ایس سی کا سلیبس بڑھا دینا چاہیے۔

2 قرآن مجید کی اہمیت

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو علم و دانش کا عظیم ترین خزانہ ہے لیکن مدارس میں یہ مناسب طریقے سے نہیں پڑھایا جاتا۔ تھوڑا سا ترجمہ، مختصر سی تفسیر (جلالین) کے ہمراہ پڑھایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مدارس میں 'تفسیر بیضاوی' کا ایک حصہ پڑھایا جاتا ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید اس سے زیادہ پڑھائے جانے کا تقاضا نہیں کرتا؟ خاص طور پر اس طویل نصاب کے ہمراہ؟
تفسیر جلالین بلاشبہ ایک مختصر مگر شاندار تفسیر ہے لیکن یہ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی تھی۔ ہر کتاب اپنے زمانے کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی سوچ کے اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ تاریخی متون کے علاوہ ہمیں طلباء کے لیے چند عصر حاضر کی تفاسیر بھی تجویز کرنی چاہئیں۔

ہر مکتبہ فکر کے علما نے پچھلی ایک دوصدی میں اردو زبان میں عظیم الشان تفاسیر لکھی ہیں۔ اسی طریقے سے دیگر صاحبان علم نے بھی غیر مسلکی طرز پر بہت عالمانہ تفاسیر لکھی ہیں جن میں قرآن پاک کے حوالے سے عہد حاضر کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح دیگر زبانوں (عربی، فارسی، انگریزی) میں بھی بہت گراں قدر تفسیری کام ہوا ہے۔ مگر عمومی طور پر اس سے استفادہ نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح مستشرقین نے قرآن مجید کی تاریخیت، تدوین، ترتیب اور متن پر بہت سے اعتراضات اٹھائے ہیں۔ ہمیں ان کے جوابات بھی پڑھانے چاہییں۔ اس سلسلے میں ہم نے بہت کم علمی کام کیا ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس اہم مسئلے پر خاص طور پر توجہ کی جائے۔ اس لیے یہ مناسب لگتا ہے کہ آٹھ سالہ روایتی مذہبی تعلیم میں کم از کم چھ سال قرآن مجید شامل نصاب رہے۔ یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ کسی بھی اعلیٰ مغربی یونیورسٹی میں قرآن مجید پر تخصص (PhD) کرنے میں کم از کم بائیس سال لگتے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ طالب علم قرآن مجید کے کسی ایک پہلو پر تخصص کی ڈگری لیتا ہے اور ہم آٹھ سال میں قران مجید، حدیث شریف اور فقہ کے عالم بن جاتے ہیں۔

آج کے مدارس میں قرآن مجید کی بہ نسبت حدیث شریف اور فقہ (اسلامی قانون) پر بہت زیادہ وقت اور توجہ صرف کی جاتی ہے۔ نصاب میں حدیث کی کم از کم سات کتابیں شامل ہیں اور فقہ بھی چار سال تک پڑھائی جاتی ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید اور حدیث پڑھاتے ہوئے سارا وقت ایک فقہی مسلک کی دوسرے فقہی مسلک سے برتری ثابت کرنے پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف کی لازوال تعلیمات کے حسن پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ ہمیں پہلے قرآن مجید اور پھر حدیث شریف پڑھانی چاہیے۔ فقہ آخر میں پڑھانی چاہیے تاکہ ہم حدیث پاک کو قرآن مجید کی روشنی میں سیکھ سکیں اور فقہ کو قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں کی روشنی میں سیکھ سکیں۔ لیکن ہم نے اس ترتیب کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم فقہ پہلے پڑھاتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص مکتب فکر کے نقطۂ نظر کی روشنی میں۔ پھر حدیث کو اس فقہ کی روشنی میں پڑھایا

جاتا ہے جس میں اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ اس خاص مکتبۂ فکر کی فقہ کی توثیق کی جاتی ہے۔ حدیث میں ہم صحیح اور مستند احادیث کے ساتھ ساتھ موضوع احادیث بھی پڑھائے چلے جاتے ہیں۔آخر میں جا کر ہم قرآن مجید کو حدیث شریف کی روشنی میں پڑھانے لگتے ہیں۔اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا شکوہ صحیح لگتا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا، لا الہ الا اللہ[1]

3 نیا طریق تدریس

پڑھانے کے تمام طریقے اپنے اندر نمایاں خصوصیات رکھتے ہیں۔ مدارس میں پڑھانے کا طریق کار پرانا ہو چکا ہے۔دنیا بھر میں اعلیٰ درجے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریس 'لیکچر پر مبنی' ہوتی ہے مگر مدارس میں تدریس متن (Text) پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ الفاظ دیگر استاد نصابی کتاب میں سے ایک سطر یا چند سطریں بلند الفاظ میں پڑھنے کے بعد ان کی وضاحت کرتا ہے۔اس طرح پوری کتاب کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔جدید تعلیمی اداروں میں سے کوئی ایک بھی علم سکھانے کے لیے یہ طریقہ استعمال نہیں کرتا۔یہ 'چمچی سے کھلانے' کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہمارے مدارس میں حافظے پر زور دیا جاتا ہے۔طالب علم کے ذہن کو مصروف کرنے اور اس کے اندر قوتِ استدلال پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلباء میں تخلیقی کام کے لیے ذہن کو استعمال کرنے کا رجحان پیدا نہیں ہوتا۔جدید سکولوں میں دورانِ تدریس نفسِ مضمون سے متعلق سوال کرنے کی بہت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے لیکن مدارس میں سوال کرنے کی نہ صرف حوصلہ شکنی کی جاتی ہے بلکہ اسے بدتمیزی اور گستاخی سمجھا جاتا ہے۔ایسا تدریسی ماحول جدّت واختراعِ تخلیق کا دم گھونٹ کر رکھ دیتا ہے۔

ہم نے کچھ روایات کی غلط تعبیر اور ان کا بے جا اطلاق کر کے سوال پوچھنے کو بُرا اور گستاخانہ رویہ قرار

[1] بال جبریل: غزلیں

دے دیا ہے جب کہ پورا قرآن مجید اس امر کا گواہ ہے کہ اسرارِ کائنات کے بارے میں جاننے اور اپنی لاعلمیوں کے دائرے سے باہر نکلنے کے لیے سوالات پوچھنے کی تربیت دی گئی ہے۔ ہمیں جدید طریق تدریس کے مطابق لیکچر سسٹم شروع کرنا چاہیے جہاں استاد ایک مضمون کے مختلف موضوعات پر درس دے اور طالب علم کتب خود پڑھیں۔

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[۱].

(اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ[۲].

(تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے ہیں؟ آسمانوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے اٹھایا گیا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے ہیں؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے)

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ[۳].

(حقیقت یہ ہے کہ ایمان لانے والوں کے لیے آسمانوں اور زمین میں بیشمار نشانیاں ہیں۔ تمہاری پیدائش میں اور ان حیوانات میں بھی بڑی نشانیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ زمین میں پھیلا رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنے والے ہیں۔ رات اور دن کے اختلاف میں اور اس رزق میں جسے اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل کرتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں)

سوالات پوچھنا ہرگز بے احترامی یا گستاخی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستحسن امر ہے۔ علم کے اعلیٰ

---

[۱] سورۃ الانبیاء، آیت: 7

[۲] سورۃ الغاشیہ، آیات: 17-20

[۳] سورۃ الجاثیہ، آیات: 3-5

مدارج تک رسائی، اختراعات و ایجادات اور انکشافات، یہ سب سوال کرنے کے مزاج اور مروجہ معلومات کو چیلنج کرنے کی عادت کا نتیجہ ہیں۔ آج کل سکولوں اور کالجوں میں باقدانہ سوچ کے باقاعدہ کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔ ہمیں بھی ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔

4 جدید زبانوں کی تدریس

مدارس میں عربی اور فارسی کے علاوہ کسی زبان کی تدریس نہیں ہوتی۔ عربی واقعتاً بڑی سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے لیکن اس کو پڑھانے کا جو طریق کار اختیار کیا جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ ان مدارس کا ایک فارغ التحصیل عصر حاضر کی عربی کے چند جملے بھی روانی سے نہیں بول سکتا جبکہ انگلش پبلک سکولوں کے تیسرے گریڈ کے طلباء انگلش روانی سے بول لیتے ہیں۔ مدارس کے عربی زبان کے نصاب میں زیادہ زور عربی قواعد (گرامر) حفظ کرنے پر دیا جاتا ہے۔

مزید برآں مدارس میں کوئی بھی جدید زبان نہیں پڑھائی جاتی۔ حتیٰ کہ اب فارسی بھی نہیں پڑھائی جاتی ماسوائے بنیادی سطح کی فارسی کے۔ انگلش، جرمن اور فرینچ پڑھانے کو 'گناہ' سمجھا جاتا ہے۔ میرے بچپن کے اساتذہ بھی انگلش سیکھنے کو کفر کہا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ زبان اپنے ساتھ مغرب کی انحطاط پذیر ثقافت بھی لاتی ہے۔ اس لیے اس سے بچنا ہی چاہیے۔ اس لیے میں بہت عرصہ تک انگریزی پڑھنے کے خلاف رہا۔ عہد حاضر میں ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم عہد حاضر کی زبانیں سیکھیں۔

5 آسان انداز تحریر

ہماری تمام روایتی اسلامی کتب بہت مشکل زبان میں لکھی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے مشکل زبان میں لکھنے کو عالمانہ شان کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ نتیجتاً ہماری نوجوان نسل قدیم ادب سے مشکل زبان کی وجہ سے کٹ (لاتعلق ہو) چکی ہے۔ ہم آج افلاطون، ارسطو اور شیکسپیئر کو محض اس لیے پڑھ سکتے ہیں کہ ان کے دور کی زبان کو جدید طرز میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے علماء اب بھی دقیق اور غیر معمولی اسلوب میں لکھتے لکھاتے ہیں اور اسے ادبی کمال اور علم کا اظہار سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر

دیکھیے قرآن مجید کی ایک آیت کی ایک نامور ہندوستانی عالم دین نے کس طرح تشریح کی ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ[1].

(وہ ہر آن نئی شان میں ہے)

یعنی ہر وقت اس کارگاہ عالم میں اس کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے اور وہ بے حد و حساب چیزیں نئی سے نئی وضع اور شکل اور اوصاف کے ساتھ پیدا کر رہا ہے۔ اس کی دنیا کبھی ایک حال میں نہیں رہتی۔ ہر لحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور خالق ہر بار اسے ایک نئی صورت سے ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

لیکن ایک عالم دین نے اس کا ترجمہ یوں کیا: 'صدورِ افعال لزوم بالذات ہے'۔

(اجرائے احکام اس کی ذات کا ایک جزو لازم ہے)

ہم اس آیت کے معنی سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ ترجمہ/تفسیر سمجھنا ناممکن ہے۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ اسلام پر لکھی گئی قدیم کتابوں کو آسان زبان میں منتقل کیا جائے۔ عربی اور فارسی میں لکھی گئی کتابوں کا بھی مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا جانا چاہیے تا کہ عام قاری کو بھی ان تک رسائی حاصل ہو اور وہ ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ عہد حاضر میں مغرب نے اپنے یونانی فلسفیوں کی تعلیمات کو بہت سادہ الفاظ میں بیان کر دیا ہے جن سے ان کی تفہیم ممکن ہوتی ہے۔

6 تحقیق کی روش

دینی مدارس میں تحقیق کا کوئی تصور یا رواج نہیں۔ ان کے ہاں صدیوں سے بس یہی کام چلا آ رہا ہے کہ کسی قدیم قلمی نسخے یا تحریر کی شرح لکھ دی۔ کسی علمی موضوع پر جدید سائنس کی روشنی میں کوئی تخلیقی کام نہیں کیا گیا۔

ایک دفعہ میں نے اسلامی معاشیات پر خود آگہی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر کئی کتابیں اکٹھی کیں مگر ان میں ایسی کتابیں بہت ہی کم تھیں جنہیں بطور نصابی کتاب

[1] سورۃ الرحمٰن، آیت:29

تجویز کیا جاسکتا یا انہیں پوسٹ گریجویٹ سطح پر پڑھایا جاسکتا۔

یہی صورت حال اسلامی قانون کے بارے میں ہے۔ گزشتہ پانچ سو برسوں کے دوران صرف چند ایک ہی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں جبکہ مغرب میں ہر سال قانون کے ہر شعبے سے متعلق کئی نئی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

ہم یہ بات کہہ کر خود کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ فلاں فلاں کتاب بہت پرانی ہے مگر اہل مغرب فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ کتاب اس سال چھپی ہے یا یہ اس کا تازہ ترین ایڈیشن ہے۔ یہ معاملہ خصوصاً قانون اور سائنسز کی کتابوں کے سلسلے میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔

مغربی سکالرز قرآن مجید، حدیث شریف اور اسلامی قانون پر مسلسل ناقدانہ تبصرے مع تازہ حوالہ جات شائع کر رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اسلامی لٹریچر پر تازہ ترین رائے مسلمانوں، بالخصوص روایتی مذہبی اہل علم تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔ اگر یہ آراء مسلمانوں تک پہنچ ہی جائیں تو عموماً ایک رُبع صدی (چالیس سال) کے بعد یہ نوبت آتی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ کسی نے ان میں سے کسی کتاب کا ترجمہ کر دیا ہو۔ اس سیاق و سباق میں بھی مسلمان ان آرا پر تعلیمی یا علم و دانش کی بنیاد پر جواب نہیں دیتے۔ صرف یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ اسلام کے منافی ہے۔ بعض اوقات مسلمان اہل مغرب کو لعن طعن کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کتاب کے اثرات جلدی ختم ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کو مغرب کے تیار کردہ اس منفی لٹریچر سے ہماری نوجوان نسل کو پہنچنے والے بے پناہ نقصان کا ذرہ بھر بھی اندازہ نہیں۔ ہمیں نوجوانوں اور تعلیم یافتہ افراد کی طرف سے روزانہ سنگین سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو وہ اسلام کے مختلف پہلوؤں اور ان تعبیرات کے حوالے سے پوچھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو اسلام کے ساتھ بہت گہری محبت ہے مگر وہ اس نام نہاد مذہبی طبقے اور ان کی غیر معقول اور سطحی تعبیراتِ اسلام سے بیزار ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلم نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ اس معاملے میں حق بجانب ہے۔ مسلمان اہل دانش نہ تو ان کی

سوچ سے آگاہ ہیں اور نہ ہی ان کی تعلیم اور ان کی زبان سے واقف ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہمیں ان نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقے سے کوئی ہمدردی بھی نہیں۔ اگر ہمارے علماء کو تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں ذرہ بھر بھی تشویش ہوتی تو وہ انہیں مذہب کی راہ پر لانے کی کوشش ضرور شروع کر چکے ہوتے یا انہیں مکمل طور پر دائرۂ اسلام کے اندر ہی رکھنے کا کوئی سنجیدہ لائحہ عمل مرتب کر لیتے۔ علماء ان کو ان کی وضع قطع اور لباس میں دیکھتے ہی گمراہ اور منحرف از اسلام قرار دینے لگتے ہیں جبکہ ان میں خاصی تعداد ایسی ہے جو قلبی طور پر مذہب سے محبت رکھتی ہے اور نماز بھی پڑھتی ہے۔ علماء کے لیے لازم ہے کہ وہ خود کو اس نسل کی اصلاح کے لیے تیار کریں کیونکہ اب تک ہم یہ کام کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔

ایک روز ایک لڑکی میرے پاس انٹرویو کے لیے آئی اور وہ مختصر لباس پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس لباس کی وجہ سے اسے ایک آوارہ لڑکی سمجھا جس کا مذہب سے کوئی تعلق واسطہ نہیں لگتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج کل کیا پڑھ رہی ہو تو وہ بولی کہ وہ حضرت جلال الدین رومیؒ پڑھ رہی ہوں۔ اس جواب پر میں ٹھٹکا اور مزید سوال پر اس نے بتایا کہ وہ امریکہ میں رہتی تھی اور اس نے مولانا رومیؒ کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا جس سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ کیونکہ مولانا رومیؒ خدا سے محبت کرتا ہے اور وہ بھی خدا سے محبت کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ مجھے زبردست جھٹکا لگا کہ میں نے اسے غیر مذہبی اور بے حیا لڑکی سمجھنے کا گناہ کیا تھا۔ میں نے یہ تاثر اس کے ظاہری لباس سے لیا تھا جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی متلاشی تھی اور اس سے تعلق رکھتی تھی۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ ایک ذہین لڑکی میرے ساتھ کام کرتی تھی۔ وہ مسلمان تھی مگر پلی بڑھی مغربی ملکوں میں تھی۔ اس کا عام رویہ بھی مغربی ثقافت سے متاثر تھا لیکن وہ اکثر مجھ سے اسلام کے بارے میں سوالات پوچھتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسلام کی صحیح سپرٹ کی تلاش میں تھی۔ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اسے پر ابوبکر

سراج الدین المعروف مارٹن لنگ[1] کی لکھی حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارک پر ایک کتاب دی۔ کتاب پڑھنے کے بعد جب وہ آئی تو اس موضوع پر اس کی اور میری طویل گفتگو ہوئی۔ اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر اپنے ایمان کی تجدید کی۔ میں اسے سیرت نبی ﷺ پر انگریزی زبان میں کسی روایتی عالم کی لکھی ہوئی اچھی سی کتاب دینا چاہتا تھا مگر نہ مل سکی۔ چنانچہ مجھے مجبوراً ایک اور مغربی نومسلم کی لکھی ہوئی کتاب دینا پڑی۔

اس نئی نسل میں ایمان کا بیج موجود ہے لیکن اس کے ماحول اور تعلیم نے اسے اسلام سے دور رکھا ہے۔ موجودہ دور کے اسلامی لٹریچر میں ان کے لیے کوئی اپیل موجود نہیں ہے۔ ان کے مسائل، ان کے سوالات، ان کی سوچیں مختلف ہیں۔ یہ روایتی اور قدامت پسند علماء کے طرز عمل سے بالکل بیزار ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس وحشت زدہ اور بوکھلائی ہوئی نسل کی رہنمائی کون کرے گا اور کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟

میں سید ابوالحسن ندویؒ کی اس رائے سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں کہ آج کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کا ذہنی انحطاط ہے۔ مثال کے طور پر شیخ ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے درمیانی عرصے میں کوئی غیر معمولی ذہانت کی حامل شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اسلامی فکر کی ذہنی اور علمی سطح پر آبیاری کر سکتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب میں متعدد بلند مرتبہ سائنسدان، سکالرز، فلاسفرز اور ماہرین معیشت پیدا ہوئے اور اپنی قوم کو ہر شعبے میں ارتقاء کی منزلوں سے ہمکنار کیا۔ ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد ان کی سطح کا کوئی نابغہ پیدا نہیں ہو سکا۔

آج مسلمان ذہنی افلاس کا شکار ہیں۔ ان میں افکار اور واقعات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ ہم حقائق کا تجزیہ کرنے کی بجائے دوسروں کو اپنی غلطیوں اور حماقتوں کا قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔ ہم بے حد جذباتی احتجاج کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اپنی ناکامیوں کے لیے

---

[1] Martin Lings: ابوبکر سراج الدین المعروف مارٹن لنگ (1909ء-2005ء) ایک انگلش مسلمان محقق، مصنف اور سکالر تھا۔

دوسروں کو ذمہ دار قرار دینے لگے ہیں۔ لیکن ہمارا اصل مسئلہ ہمارا ذہنی بحران اور ذہانت کا فقدان ہے۔ ہم کام نہیں کرتے، محنت سے جی چراتے ہیں اور ذہنوں کو ترقی دینے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ آیئے ایک مثال لیتے ہیں۔ بھارت میں دارالعلوم دیوبند[1] دنیائے اسلام کا نہایت مشہور و معروف مدرسہ ہے۔ لیکن اس کے پاس ایک بھی تحقیقی پروگرام نہیں ہے۔ ہارورڈ سکول آف ڈیوینیٹی (Harvard School of Divinity) جو ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے بارہ سکولوں میں سے ایک ہے۔ اس میں تحقیق کی مندرجہ ذیل سہولتیں موجود ہیں:

(1) ہارورڈ کے ریسرچ اینڈ رایٹنگ فیکلٹی ممبران کی تحقیق کے خصوصی شعبوں میں بین الکلیاتی تحقیق، ہمکارانہ تحقیق اور رفقائے کار کے ساتھ مکالمہ شامل ہے۔ حالیہ منصوبوں میں درج ذیل امور شامل ہیں:

(i) عقیدۂ بشارت الانجیل (Nigerian evangelicalism) کی تفتیش اور اس عقیدہ کے علمبرداروں نے اسرائیل، یورپ اور امریکہ کے بعض حصوں میں جو علاقائی، عالمی اور سیاسی کردار ادا کیا ہے اس کا مطالعہ؛

(ii) اسلامی دنیا کے مختلف اداروں کے تصورات اور ان کے طبی، مذہبی اور ثقافتی نظریاتِ اصناف اور تذکیر و تانیث کے بارے میں ایک تحقیقی منصوبہ۔

(iii) 'ہمزاد' (divine double) سے متعلق نئی تحریریں جن میں زمانۂ قدیم سے مشہور روایت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق ہر شخص کا ایک 'ہمزاد ہوتا ہے جو اس کے لیے عصر حاضر کے فلسفیانہ خیالات میں مشیر ہوتا ہے اور دینیاتی یادداشتوں کو واپس لانے کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔

---

[1] دارالعلوم دیوبند ہندوستان کے شمالی صوبہ اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں واقع ہے۔ اسے 1866ء میں مولانا قاسم نانوتویؒ نے برطانوی سامراجیت کے دور استبداد میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریک کو جاری رکھنے، مسلمانانِ ہند کے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھنے، مسلک حنفیہ کی مسند تدریس کو منور رکھنے، دشمنان اسلام، مشرکین ہندوستان اور عیسائی مبلغین کے اسلام پر اعتراضات کا جواب دینے کے لیے قائم فرمایا تھا۔ اسلامی تعلیمات کی تدریس کے لیے الازہر یونیورسٹی، مصر کے بعد اس درس گاہ کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی۔

(iv) رواں مذہبی ادبی منصوبہ، جو مذہب اور تعلیم کے ماخذات کے بارے میں تحقیق میں مدد دیتا ہے۔ بالخصوص ایک عالمگیر دنیا میں مذہب، شہریت اور اخلاقی تعلیم کے مابین تعلق کی تحقیق۔

(v) قبطی انجیل پیپرس، یسوع کی بیوی کی انجیل کے بارے میں تازہ ترین تحقیق۔

(2) ہارورڈز کے مراکز اور پروگرام حسب ذیل ہیں:

(i) مرکز برائے تحقیق عالمی مذاہب: جس نے مذاہب کے تاریخی اور عصر حاضر کے باہمی تعلقات پر غور وخوض کو فروغ دیا اور مذہبی گروہوں اور آج مذہب کا مطالعہ کرنے والوں کو درپیش دینیاتی فلسفیانہ، تقابلی، سیاسی اور اخلاقی چیلنجوں سے آگاہ کیا۔

(ii) خواتین سے متعلقہ مذہبی مطالعہ وتحقیق کا پروگرام تاکہ پتہ چل سکے کہ مذہبی روایات نے خواتین اور مردوں کے کردار کے تعین میں بنیادی طور پر کیا کردار ادا کیا ہے۔

(iii) منصوبۂ تکثیریت: (pluralism project) یہ امریکہ کے تبدل پذیر مذہبی منظر کی موجدانہ تحقیق ہے تاکہ ہمارے کثیر المذاہب معاشرے کے خدوخال کو ضابطۂ تحریر میں لایا جا سکے۔ بین المذاہب مکالمے کی نئی شکلیں تیار کی جاسکیں۔ شہری زندگی پر مذہبی تنوع کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو عالمی ڈھانچے کے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جاسکے۔

(iv) مذہبی خواندگی کا منصوبہ: یہ ویب سائیٹ تک کھلی رسائی کے ذریعے مذاہب کے عمومی مطالعے کے لیے مواد اکٹھا کرنے، تخلیق کرنے اور خصوصی روایات مرتب کرنے کا منصوبہ ہے جو بنیادی طور پر پبلک سکول ٹیچرز اور ان کے شاگردوں کے استفادے کے لیے ہے۔

(v) سائنس، مذہب اور ثقافت پر مذاکرے، سیمینارز اور ورکشاپس کا انعقاد جن کے ذریعے بین الکلیاتی مباحث ہوتے ہیں اور ہارورڈ یونیورسٹی کے اندر اور باہر کے سکالرز اور طلبا میں روابط کو فروغ ملتا ہے۔

(vi) مذاہب اور عمل امن اس کے متقاضی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پیغام میں نظم وضبط کی تلقین کریں۔

اہل علم کے ساتھ رابطے بڑھائیں اوراس امر کی جستجو کریں کہ دنیا بھر کے افراد اور معاشرے مذہبی اور روحانی وسائل کے ذریعے کس طرح باہمی مفاہمت اور خوشگوار تعلقات، باہمی تعاون، بہبود عامہ کے کام کیے اور اپنے پیغام امن کے ذریعے کس طرح مذہبی، فرقہ وارانہ، قوم پرستانہ، نسلی اور ثقافتی اختلافات پر قابو پایا اور کس طرح ایسی مساعی عصر حاضر میں قیام امن کے لیے نظریہ سازی اور عملی اقدامات کو فروغ دے سکتی ہیں۔

(3) ہارورڈ کے پاس درج ذیل باقاعدہ تحقیقی مطبوعات ہیں:

(i) ہارورڈ یونیورسٹی بلٹین: اس کا مقصد مذہب کے بارے میں غیر فرقہ وارانہ جائزہ پیش کرنا اور عہد حاضر کی حقیقتوں پر توجہ دینا ہے جس کی وجہ سے اکیڈمی کے اندر اور باہر، دونوں حلقوں میں اظہار پسندیدگی ہورہا ہے۔ یہ پرچہ دنیا بھر کے 20,000 افراد کے پاس پہنچتا ہے۔

(ii) ہارورڈ تھیالوجیکل ریویو (Harvard Theological Review)، یہ امریکہ میں قدیم ترین علمی اور دینیاتی جرائد میں سے ہے۔ یہ تمام روایات اور ادوار کے بارے میں تاریخ اور مذہبی فکر پیش کرتا ہے جن میں عبرانی بائیبل، عہد نامہ جدید، مسیحیت، یہودیت، تھیالوجی، اخلاقیات، آثار قدیمہ اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ شامل ہے۔

(iii) 'جرنل آف فیمینسٹ سٹڈیز ان ریلیجن' (Journal of Feminist Studies in Religion) یہ ایک ششماہی رسالہ ہے۔ یہ مذہبی تعلیمات کے حوالہ سے قدیم ترین غیر مذہبی نسوانی تعلیمی رسالہ ہے[1]۔

نیدرلینڈ کے انٹر یونیورسٹی سکول آف اسلامک سٹڈیز میں ہر سال سینکڑوں تحقیقی مقالے شائع ہوتے ہیں۔ آیئے حالیہ برسوں کے شماروں میں شائع ہونے والے چند موضوعات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں:

(i) مسلم اہل دانش اور معاشرہ، سترویں صدی عیسوی کے وسطی سوڈانی افریقہ میں۔

[1] http://hds.harvard.edu

(ii) یورپ میں اسلامی طلاقیں: یورپی اور اسلامی قانونی نظاموں کے درمیان خلیج کیسے کم کی جائے۔

(iii) پاکستانی شادیاں اور جرمنی اور انگلینڈ کے پرائیویٹ انٹرنیشنل قوانین۔

(iv) ایک صحرا میں مچنے والا شور: ڈچ مسیحی مبلغ کا جاوا کے اسلام سے مناظرہ 1850ء-1910ء۔

(v) اسلامی جلد سازی کی روایت۔

(vi) نیدرلینڈز اور بیلجیئم میں اسلامی طریق تدفین: قانونی، مذہبی اور معاشرتی پہلو۔

(vii) 'ہوسکتا ہے کہ میں اب بھی اس کی بیوی ہوں'۔ڈچ مراکشی اور ڈچ مصری خاندانوں میں ماورائے قومی سرحدات طلاق۔

(viii) لبنان میں سلفی مسلک: مقامی اور ماورائے سرحدات وسائل۔

(ix) مراکش میں نسوانی مذہبی ایجنٹس: قدیم روایتیں اور نئے مناظر۔

(x) شام میں عائلی قوانین: تعددِ قوانین، طورطریقے اور قانونی روایات۔

(xi) آموزش استناد: سلفی مسلک کے پیروکار جرمن اور ڈچ مسلمانوں کی مذہبی رسوم، مجالس میں اور گپ شپ کے کمروں میں۔

(xii) انڈونیشیا کے جزیرہ میڈورا میں اسلام اور سیاست: علما اور دیگر مقامی رہنما، اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے کوشاں۔

(xiii) قدیم مسلم مصر میں آدابِ مسرت اور اظہارِ غم، پودے سے بنے کاغذ پر لکھے ہوئے خطوط، متن اور مندرجات۔

(xiv) قانونی ادب کا طریق تدوین: سوڈان میں نمیری اور بشیر کے دورِ حکومت میں اسلامی فوجداری قانون سازی اور سپریم کورٹ کیس لاء۔

(xv) بہتر مسلمان کیسے بنا جائے: آسیہہ (انڈونیشیا) میں اطاعت نافذ کرنے کا اختیار اور اصلاحِ اخلاق۔

(xvi) مابین تاریخ افسانہ: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات از قلم ابن شہاب الزہریؒ۔

(xvii) شمالی نائیجریا میں اسلامی فوجداری قانون: سیاست مذہب اور عدالتی طریق کار۔
(xviii) ایک تارک الدنیا جہادی سلفی: ابومحمد المقدسی کا نظریۂ حیات اور اس کے اثرات۔
(xix) اسلامی اصلاح پسندی اور عیسائیت: محمد رشید رضا اور ان کے رفقاء کی تحریروں کا ایک تنقیدی جائزہ۔
(xx) اسلام اور جسمانی معذوری: اسلامی تعلیمات اور فقہ کی روشنی میں۔

کیا ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات کا کوئی ایسا ادارہ ہے جو اس درجے کی تحقیق کے لیے کوششیں کر رہا ہو؟ اس کا جواب ہے 'بالکل نہیں'۔

7 اختلافِ رائے کا احترام

اسلام مختلف عقائد، مذاہب، مسالک اور مکاتب فکر کو کھلے دل سے دیکھتا ہے۔ اس امر کا اعلان اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ مذہبی تکثیریت سراسر منشائے الٰہی کا نتیجہ ہے۔ وہ چاہتا تو بنی نوع انسان کو جبراً ایک ہی عقیدہ اختیار کروا سکتا تھا یا ایک طرزِ عمل پر مجبور کر سکتا تھا۔ جیسا کہ اس نے کائنات کو ایک لگے بندھے طریقے کی پابند کر رکھا ہے۔ تاہم اس نے ہم پر کوئی ایک طریقہ مسلط نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے ہمیں پسند کی آزادی عطا کر رکھی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ[۱].

(اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے عہد حاضر کے ایک عالم دین لکھتے ہیں: 'اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا طرف دار سمجھ کر بُرے بھلے طریقے سے اپنے مذہب کو (جسے وہ

---

۱ سورۃ النحل، آیت:93

خدائی مذہب سمجھ رہا ہے) فروغ دینے اور دوسرے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی یہ حرکت سراسر اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہے۔ اگر اللہ پاک کی منشا واقعی یہی ہوتی کہ انسان سے مذہبی اختیار چھین لیا جائے اور چارو ناچار سارے انسانوں کو ایک ہی مذہب کا پیروکار بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو اپنے نام نہاد 'طرف داروں' کی اور ان کے ذلیل ہتھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا۔ وہ سب کو مومن و فرماں بردار پیدا کر دیتا اور کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا۔ پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان و اطاعت کی راہ سے بال برابر بھی جنبش کر سکتا؟

اسی طرح قرآن پاک یہ بھی کہتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ[1].

(اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمھیں ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ تمھیں اس میں آزماتا ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے۔ پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تم سب کا لوٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تمھیں بتائے گا جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ[2].

(اور اگر آپ کا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے)

وہ اختلاف رائے پیدا کرنے کے لیے اپنے منصوبے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انسانوں کو راہ کے انتخاب کا حق دیتا ہے۔ اس نے بنی نوع انسان کو ایک جبلی فطرت ودیعت کی ہے جس کے اندر غلط اور صحیح کے درمیان امتیاز کر سکنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اعلان کیا گیا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ

---

[1] سورۃ المائدہ، آیت: 48

[2] سورۃ ھود، آیت: 118

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ[۱].

(دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ اس لیے جو شخص باطل معبودوں کا انکار کر کے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے اور جاننے والا ہے)

نبی علیہ السلام صرف حق بات واضح کر سکتا ہے لیکن لوگوں پر جبر کر کے ان سے اپنے نظریات منوا نہیں سکتا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ[۲].

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نصیحت کرتے رہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے ذمہ دار نہیں ہیں)

ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کہتے ہیں: اگر معقول دلیل سے کوئی شخص بات نہیں مانتا تو نہ مانے۔ تمہارے سپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں سے زبردستی منواؤ۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح اور غلط کا فرق بتا دو اور غلط پر چلنے کے انجام سے خبردار کر دو۔ سو یہ فرض تم انجام دیتے رہو[۳]۔

یہ آیات کافی حد تک واضح کر رہی ہیں کہ اختلافات کی موجودگی خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ کی ایک سوچی سمجھی سکیم کی وجہ سے ہے جو خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ تمام انسان ایک ہی عقیدے اور سوچ کے حامل ہوں اس لیے اختلاف یا آرا کا الگ الگ ہونا خدائی دانش وحکمت سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ اس دینیاتی تناظر میں سے ایک قدرتی نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا نے خود اپنے بندوں کو مختلف آرا رکھنے کا حق دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کو ایک الوہی حقیقت کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیروکاروں میں اختلافِ رائے کو ہمیشہ گوارا کیا ہے اور اپنے

---

۱ سورۃ البقرۃ، آیت:256

۲ سورۃ الغاشیہ، آیات:21-22

۳ تفہیم القرآن ذیل مذکورہ بالا

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کسی خاص مسئلے پر مختلف آراء رکھنے سے منع نہیں کیا۔ اس کی ایک مثال غزوہ خندق میں پیش آئی۔ جنگ خندق سے فارغ ہو کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ کو حکم دیا کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں جائیں اور وہاں جا کر عصر کی نماز پڑھیں۔ وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم راستے میں نماز نہیں پڑھیں گے بلکہ منزل پر پہنچ کر پڑھیں گے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھیں۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے۔ راستے میں نماز پڑھ لی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم دیا تھا اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ جلد از جلد منزل پر پہنچا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں گروہوں کی رائے کو منظور فرمایا[1]۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان قرآن مجید کے احکامات اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کئی فرمودات کی تعبیر کے بارے میں کئی سنجیدہ اختلافات تھے:

(i) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مرتد عورتوں کے مسئلے پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اختلاف تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نظریئے سے اختلاف کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران ان سب عورتوں کو آزاد کر کے انہیں ان کے سرپرستوں کے حوالے کر دیا۔

(ii) شام اور عراق کے مفتوحہ علاقوں کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تعامل سے اختلاف کرتے ہوئے یہ علاقے فاتح سپاہیوں میں تقسیم نہیں کئے بلکہ انہیں اوقاف قرار دے دیا (اجتماعی مفاد کے لیے ریاستی تحویل میں لے لیا)۔

(iii) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مابین کئی قانونی مسئلوں پر اختلافات تھے (اعلام الموقعین عن رب العالمین) لیکن اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کا بے حد

---

[1] صحیح بخاری، ج:2، رقم الحدیث:1342

احترام کرتے تھے۔

(iv) ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا جنگ جمل میں ان کے مقابل مشرکین تھے تو انہوں نے جواب دیا:

- وہ مشرک نہیں تھے بلکہ شرک سے تو بھاگ کر مسلمان ہوئے تھے۔
- پھر پوچھا گیا کیا وہ منافقین تھے؟
- آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ منافقین تو اللہ تعالیٰ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔
- پھر پوچھا گیا کہ وہ کون تھے؟
- آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: وہ ہمارے بھائی تھے جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کردی تھی[۱]۔

(v) امام حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے جانشینوں کے درمیان اختلاف تا قیامت ختم نہیں ہوسکتا، کیونکہ اسے دور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ ایک گروہ کو حق پر قائم اور دوسرے کو ناحق پر قائم قرار دے دیا جائے اور یہ ناممکن ہے[۲]۔

ابتدائی دور کے مسلم فقہا میں بھی اختلاف ہوتے رہتے تھے۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ حضرت امام شافعیؒ نمازِ فجر میں دعائے قنوت پڑھنے کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مؤکدہ سمجھتے تھے جب کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اس نظریئے کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے روضے پر گئے اور انہوں نے فجر کی نماز پڑھتے ہوئے دعائے قنوت نہ پڑھی۔ جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے دربار میں ان سے کیسے اختلاف کرسکتا ہوں[۳]۔

مسلمانوں کو آرا کے ان اختلافات کو ایک قدرتی امر سمجھنا چاہیے اور انہیں ایک حقیقت گردانا

---

[۱] سنن کبریٰ للبیہقی، ج:9، رقم الحدیث:2869 ودیگر

[۲] وحدت امت، ص:25

[۳] Fiqh Al-Imam, p. 24

چاہیے۔ اہل اسلام کو ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ایک سعی لا حاصل ہوگی۔ اس کی بجائے انہیں ان اختلافات کو ایک رحمت سمجھ کر پُرامن بقائے باہمی کا فن سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے بالکل بجا کہا ہے: فہم فلسفہ کے میدان میں کسی چیز کو درجۂ کمال حاصل نہیں۔ ہمارے علم کی بنیاد میں وسعت پیدا ہونے اور فکر کے لیے در کھلنے سے بہت سے دیگر خیالات، غالباً ان لیکچرز میں پیش کردہ خیالات سے کہیں زیادہ بہتر، ظہور پذیر ہو جائیں گے۔ تاہم یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم انسانی علم میں ہونے والے اضافے پر نظر رکھیں۔ اس سلسلے میں ہمیں حقِ تنقید کو آزادی سے استعمال کرنا ہوگا[۱]۔

ان تعلیمات کے برعکس تقریباً ہر مدرسہ فرقے پر مبنی ہے۔ ان کا نصاب اور امتحانات فرقہ واریت پر استوار ہیں۔ مثال کے طور پر دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، شیعہ اور جماعت اسلامی، سب کے اپنے اپنے تعلیمی بورڈز ہیں۔ ان مدارس کے اساتذہ کی توانائیاں ایک دوسرے کے عقائد اور نظریات کا رد پڑھانے پر صرف ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کے عظیم شیخ الحدیث سید انور شاہ کشمیریؒ[۲] کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ایک بار وہ بہت مغموم بیٹھے تھے۔ ان سے ان کی پریشانی کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی ساری زندگی یہ ثابت کرتے کرتے ضائع کر دی ہے کہ فقہ حنفی باقی فقہ پر فوقیت رکھتی ہے۔

عمومی مدرسوں کا فارغ التحصیل ہر شخص اپنے آپ کو 'عالم' سمجھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ صرف وہی (نہ کہ کوئی دوسرا) اسلام کی نمائندگی کا حق ادا کر رہا ہے۔ ہم دیگر لوگوں کو اسلام کا صحیح مبلغ نہیں سمجھتے۔ حضرت محمد اقبالؒ نے یورپی اہل ایمان میں مقبولیت حاصل کر لی تھی لیکن ہندوستان اور پاکستان کے علماء انہیں مذہبی سکالر تسلیم نہیں کرتے کیونکہ وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل نہیں

---

[۱] The Reconstruction of Religious Thought In Islam

[۲] سید محمد انور شاہ کشمیریؒ (1875ء-1933ء) برصغیر پاک و ہند کے ایک نامور عالم دین، مفسر، محدث اور صوفی بزرگ تھے۔ اپنے کیریئر کے دوران انہوں نے متعدد مشہور اداروں میں پڑھایا جن میں دارالعلوم دیوبند بھی شامل تھا۔

تھے۔یہی حال علامہ محمد اسدؒ کا ہے۔

یہ کوئی راز نہیں کہ سر ولیم میور[1] نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو سوانح حیات لکھی اس میں اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو داغ دار کرنے کی ناپاک جسارت کی تھی۔ اس کے شائع ہونے کے بعد سر سید احمد خان اپنی ساری جائیداد فروخت کرکے انگلینڈ چلے گئے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں ولیم میور کے اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیا جائے۔اس پر انہوں نے کئی سال کی محنت کے بعد 'خطبات احمدیہ' تیار کی۔ یہ اس موضوع پر ایک شاندار کتاب ہے۔لیکن ہم نے اسلام اور امت مسلمہ کے لیے ان کی تمام خدمات کو مسترد اور نظر انداز کر دیا محض اس بنا پر کہ ان کے چند نظریات معروف علماء کے خیالات سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ہمیں اختلاف برداشت کرنا چاہیے اور کسی بھی اچھی چیز کو قبول کرنا چاہیے۔یہی عالمانہ رویہ ہے اور ہمارے قدیم علما کا یہی رویہ رہا ہے۔

میں نے علامہ محمد اسد کا وہ خط پڑھا ہے جس میں انہوں نے مغموم دل کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہیں کہ پاکستان میں ایک خاص گروہ نے ان کے خلاف تکفیر کی مہم چلا دی ہے۔جس پر انہوں نے شکستہ دل ہوکر پاکستان چھوڑ دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مراکش میں آباد ہوگئے۔ میری رائے میں ان کی تفسیر قرآن مجید انگریزی میں اب تک لکھی گئی مختصر تفاسیر میں سے بہترین تفسیر ہے۔ان کی تفسیر صحیح بخاری اور دیگر کتابیں بھی اسلامی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔بعض لوگوں نے ان پر ارتکابِ کفر کا الزام لگا دیا کیونکہ وہ اسلام کے چند عقائد کے بارے میں بعض مروجہ نظریات سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن ان کا کوئی نظریہ ایسا نہ تھا جو پہلے کچھ عظیم علما کا نہ ہو۔

ہم صاحبان ایمان لوگ رفتہ رفتہ برداشت اور رواداری ترک کر رہے ہیں۔ہمیں کیا ہوگیا ہے؟ ہم معمولی سا اختلاف رائے بھی برداشت کرنے سے معذور ہوگئے ہیں۔متعدد اہل علم کو اختلاف رائے پر یا اس بنا پر قتل کر دیا گیا کہ کسی مخصوص فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے علماء کو مسلم

---

[1] Sir William Muir: سر ولیم میور (1819ء-1905ء) ایک سکاٹش مستشرق تھا۔

ممالک کو چھوڑ کر مغربی ممالک میں پناہ لینی پڑی۔ یہ بالکل غیر علمی اور غیر معقول رویہ ہے جس نے ہم میں علم سے مخاصمت پیدا کر دی ہے۔

8 تخصیص علوم

اب ماہرین خصوصی کا معاملہ لے لیجئے۔ مدارس کا ایک طالب علم آٹھ سے دس سال درسِ نظامی پڑھنے کے بعد ایک سند (ڈگری) لیتا ہے۔ مزید ایک یا دو سال صرف کر کے مفتی بن جاتا ہے۔ اس سے وہ اسلامی قانون سے متعلقہ کسی مسئلے پر رائے دینے کے قابل سمجھ لیا جاتا ہے۔ پھر وہ عائلی امور، مذہبی معاملات، شخصی قوانین، اقتصادی اور بینکنگ کے معاملات، تجارت اور بزنس سے متعلق فتوے جاری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مدرسے کے ایک فارغ التحصیل کے بارے میں یہ رائے قائم کر لی جاتی ہے کہ وہ قرآن مجید، حدیث شریف، منطق، اسلامی قانون، عربی ادب، فلکیات اور دیگر متعلقہ موضوعات کے بارے میں مہارت حاصل کر چکا ہے۔ لہٰذا وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں حتمی فیصلہ صادر کرنے کا اہل ہے جو پوری امت مسلمہ پر قابلِ اطلاق ہوگا۔

جدید طریق تعلیم اس طریق تعلیم سے کلیتاً مختلف ہے۔ قانون کی مثال لے لیجئے۔ ایک طالب علم چودہ سال کی پڑھائی کے بعد مزید تین سال لگا کر قانون میں بیچلرز ڈگری یعنی ایل ایل بی کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ مزید پڑھنا چاہتا ہے تو مزید تین سے پانچ برس میں اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرتا ہے۔ اس کا ڈاکٹر کی سطح کا تفصیلی مقالہ (Doctoral dissertation) قانون کے ایک شعبے کے کسی ایک خصوصی موضوع پر ہوتا ہے جو کہ قانون کا صرف ایک پہلو ہوتا ہے۔ پھر وہ نوجوان کسی یونیورسٹی میں بطور لیکچرز تعینات ہو جاتا ہے۔ اس حیثیت سے پوسٹ گریجویشن کی سطح کی تدریس کے تقریباً 25 / 30 سال بعد پروفیسر بنتا ہے۔ اگر آپ اس سے اس کے مخصوص دائرے سے باہر تعلق رکھنے والا کوئی سوال پوچھیں گے تو وہ صرف یہ کہے گا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کسی متعلقہ شخص سے سوال کریں۔

یہ پروفیسر اس سوال کا جواب نہ دے سکنے اور کسی اور کا نام تجویز کرنے پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں

کرے گا۔ دوسری طرف ایک مدرسے میں دس سال پڑھنے والا نوجوان بغیر کسی جھجک کے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں پورے اعتماد سے اپنا حتمی فیصلہ سنا دے گا اور حرام و حلال پر بھی فوراً رائے دے دے گا۔ یہ رویہ اور طریق عمل آج کے دور میں کام نہیں دیتا۔

ہماری سوچ بڑی عجیب ہے۔ اگر کوئی ہم سے نئی قانونی تحقیق کے بارے میں سوال کرتا ہے تو ہم فوراً جواب دیتے ہیں کہ تمام سوالوں کا جواب اور تمام مسائل کا حل ہمارے گزرے ہوئے فقہاءؒ نے پیش کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت امام مالکؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت امام جعفر صادقؒ بلند پایہ فقیہ تھے۔ جنہوں نے اسلامی فقہ کے اصول وضع کر دیئے تھے اور اسلامی فقہ میں ان کی خوب وضاحت کر دی گئی ہے۔ تاہم ان کے اصولوں کو اطلاق کی ضرورت ہے یا عہد حاضر میں ان کی نئے سرے سے تعبیر کی جانی چاہیے۔ آج کئی نئے مسئلے کھڑے ہو چکے ہیں جو اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں انہی اصولوں کی روشنی میں حل کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر جہاز رانی، ہوا بازی اور بیمہ وغیرہ۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے دنیا کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ ان فاضل فقہاءؒ نے ان مسائل پر کوئی بحث نہیں کی کیونکہ ان کے زمانے میں یہ مسائل موجود ہی نہیں تھے۔ مجھے ان موضوعات پر ایک کتاب بھی دیکھنے کو نہیں ملی جو اسلام اور اسلامی اصولوں کے حوالوں سے ان شعبوں میں بزنس کرنے پر روشنی ڈالتی ہو۔ آج اس پایہ کے اسلامی سکالرز کہاں ہیں جو اتنا علم رکھتے ہوں کہ ان مسائل پر روشنی ڈال سکیں؟

ہمیں اپنے اسلاف ہی کے کارہائے نمایاں پر اظہار فخر و مباہات کرتے نہیں رہ جانا چاہیے۔ دنیا نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی ارتقاء کی کئی کئی منزلیں طے کر چکا ہے اور ہم دنیا کی دیگر قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ پتھر کا زمانہ نہیں بلکہ انٹرنیٹ کا دور ہے۔ یہ گھوڑوں، نیزوں اور تلواروں کا نہیں مزائلوں اور ایٹم بموں کا زمانہ ہے۔ یہ جذباتیت اور شعلہ بیانیوں کا زمانہ نہیں بلکہ عقل اور منطقی دلائل کا زمانہ ہے۔ لیکن ہم اس اذعانی راسخ الاعتقادی

(dogmatic intellectual logjam) کے تعطل سے باہر نکلنے اور اپنی فکر و عمل میں تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ دنیائے اسلام کے اہم ترین مدارس میں سے ایک دارالعلوم دیوبند میں بھی اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں کی تخصیص کے لیے موزوں کورسز کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس میں صرف ایک سال کے تفسیر قرآن مجید، فقہ، دینیات اور ادب کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ ان تخصیصی کورسز کے نصاب، مدرسہ کی ویب سائیٹس پر دستیاب ہیں لیکن ان کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانے اور متروک ہیں[1]۔

دوسری طرف ہارورڈ الٰہیاتی سکول (Divinity School of the Harvard University) میں درج ذیل چار ڈگری پروگرام ہیں جو دو سے پانچ سالہ عرصے کے ہیں[2]:

(i) ماسٹر آف تھیالوجیکل سٹڈیز (Master of Theological Studies)

(ii) ماسٹر آف ڈیوینٹی (Master of Divinity)

(iii) ماسٹر آف تھیالوجی (Master of Theology)

(iv) ڈاکٹر آف فلاسفی (Doctor of Philosophy)

9 کتابوں کی فراہمی

مسلمانوں نے اپنے آباؤ اجداد کی بھی کتابیں وراثت میں حاصل نہیں کیں۔ حتیٰ کہ ابن سینا، الزہراوی، عمر خیام، الفارابی، ابن نفیس اور ابوالہیثم کی تصانیف مسلم دنیا میں نہ پرائیویٹ لائبریریوں میں پائی جاتی ہیں اور نہ ہی پبلک لائبریریوں میں۔ ان کے ترجمے بلکہ اصل مخطوطات مغرب کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ قدیم کتابوں میں سے صرف حضور نبی

[1] http://www.darululoomdesbnd.com/english

[2] http:/hds.harvards.edu

کریم ﷺ (سیرت ابن اسحاق) ملی ہے۔اس کی تدوین الفریڈ گیلیوم[۱] نے کی ہے۔اگر کوئی مسلمان آج قدیم مسلم فلسفے یا ادب پر تحقیق کرنا چاہیے تو وہ جامعۃ الازہر، دارالعلوم دیوبند یا دارالعلوم بریلی نہیں جائے گا بلکہ یونیورسٹی آف لائیڈن ہالینڈ یا آکسفورڈ برطانیہ جائے گا جہاں سے اسے اپنی تحقیق کے لیے مطلوبہ مواد مل جائے گا۔

لائیڈن یونیورسٹی کی مشرق وسطیٰ سے متعلق جمع کردہ کتب 6000 قلمی نسخوں اور مخطوطات پر مشتمل ہے اور ان سے کہیں زیادہ نایاب مطبوعہ کتابیں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کی زبانوں میں ہیں جو 1950ء تک کے مغربی مستشرقین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ پہلے کے سکالرز میں سے ایک جوزف جسٹس سکالیگر[۲] نے اپنی عربی فارسی اور ترکی زبان کے قلمی نسخے اور مطبوعہ کتابیں بھی لائبریری کو ہدیہ کر دیں۔ لیوینس وارنر[۳] نے اپنے پرائیویٹ ذخیرے میں سے 1000 قلمی نسخے جو بیشتر عربی، فارسی اور ترکی زبان میں تھے لائیڈن یونیورسٹی کو دے دیئے۔ 1883ء میں یونیورسٹی لائبریری نے مدینہ منورہ کے عالم امین بن حسن المدنی[۴] سے 700 قلمی نسخوں کا مجموعہ

[۱] Alfred Guillaume: الفریڈ گیلیوم (1888ء-1965ء) ایک برطانوی عربی دانشور، اسلام، بائبل اور عہد نامہ قدیم کا عالم تھا۔

[۲] Joseph Justus Scaliger: جوزف جسٹس سکالیگر (1540ء-1609ء) ایک فرانسیسی مذہبی رہنما اور عالم تھا جس نے پہلی دفعہ قدیم ادبی تاریخ میں یونانی تاریخ کے ساتھ ساتھ ایرانی، بابلی، مصری اور یہودی تاریخ کو بھی شامل کیا۔

[۳] Levinus Warner: لیوینس وارنر (1618ء-1665ء) ایک جرمن مستشرق، مخطوطات اکٹھے کرنے والا اور سلطنت عثمانیہ میں جمہوریہ ہلند (Dutch Republic) کا سفیر تھا۔

[۴] امین بن حسن مدنی ایک مسلمان مدینہ منورہ کا رہائشی محقق اور استاد تھا جو کتابوں کا کاروبار بھی کرتا تھا جس نے اپنی زندگی میں بہت کلاسیکل ادب اور اسلام کے بارے میں عربی نسخوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی جسے لائیڈن یونیورسٹی نے اپنی لائبریری کے لیے خرید لیا۔

خرید لیا۔ سناوک ہرگرونج[۱] نے جو نیدرلینڈز کا غالباً سب سے بڑا مستشرق تھا اپنے آخری وقت میں اپنی ساری پرائیویٹ لائبریری اور تاریخی دستاویزات لائیڈن یونیورسٹی لائبریری کے لیے وقف کر دیں۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد 1960ء کے عشرے میں لائیڈن یونورسٹی کی لائبریری نے عثمانی ترکی کا عظیم ذخیرہ جو غالباً سلطان مراد پنجم[۲] اور اس کے ورثاء کی ملکیت تھا، بھی خرید لیا۔ 2009ء میں یونیورسٹی لائبریری نے پیپلز ری پبلک آف چائنا کے صوبہ سنکیانگ (Xinjiang) سے اسلامی قلمی نسخے حاصل کیے[۳]۔

آپ مسلم دنیا کے کسی مدرسے کا کتب خانہ دیکھ لیں۔ اس سے زیادہ کتابیں تو میں نے مغرب میں کئی پروفیسروں کے گھروں میں دیکھی ہیں۔ ہماری کوئی اچھی اسلامی لائبریری نہیں ہے۔ اسلامی قانون پر کتابیں ملتی ہی نہیں۔ لنکنز ان (لندن) میں، میں نے 1997ء میں ایک بار احسان (equity) کے قانون پر کتب تلاش کیں۔ جب میں نے کمپیوٹر میں احسان لکھا تو اس نے اپنی سکرین پر 241 کتابوں کی فہرست، ان کے مصنفین کے نام، چھاپے خانے کا نام اور صفحات کی تعداد وغیرہ پانچ سیکنڈ میں بتا دی۔ ہمارے بہترین مدارس میں نہ تو اتنی کتب ہیں اور نہ ہی ان کو ڈھونڈنے کا نظام (کیٹلاگ) ہے۔ علم کہاں سے آئے گا؟

اب تو تحقیق مزید آسان ہوگئی ہے۔ بازار میں ستر روپے میں کمپیوٹر کی ایک سی ڈی (CD) ملتی ہے، جس میں چار قاریوں کی آواز میں پورے قرآن کی تلاوت ہے، کئی تفاسیر ہیں، صحاح ستہ (حدیث کی چھ بڑی کتب) ہیں، فقہ کی کئی کتابیں ہیں، سیرت پر کئی کتب ہیں۔ اب معاملہ اس سے بھی آگے چلا گیا ہے اور سب کچھ ویب سائٹ پر موجود ہے۔

---

[۱] Christiaan Snouck Hurgronje: کرسچین سناوک ہرگرونج (1857ء-1936ء) نیدرلینڈز کا سب سے بڑا مستشرق، مشرقی تہذیب وتمدن اور زبان کا عالم اور نیدرلینڈز کے حکومت کا مقامی معاملات کا مشیر تھا۔

[۲] سلطان مراد پنجم (1840ء-1904ء) سلطنت عثمانیہ کا تینسواں خلیفہ تھا جو 30 مئی 1876ء سے 31 اگست 1876ء تک برسر اقتدار رہا۔

[۳] http://www.library.leiden.edu

تلاش اتنی آسان ہے کہ آپ کسی ڈیٹا بیس میں وضو کا لفظ تلاش کریں تو قرآن مجید کی تمام متعلقہ آیات، تمام کتب میں موجود متعلقہ احادیث، فقہ کی کتب سے آرا چند سیکنڈ میں آپ کے سامنے آ جائیں گی۔ اس کے بعد آپ سب کو پڑھ کر جو چاہیں رائے بنائیں۔ یہ تلاش اگر میں دارالعلوم کی لائبریری میں کرنا چاہوں تو مجھے ایک ماہ (26 لاکھ سیکنڈ) لگیں گے۔ یہی فرق ہمارا اور مغرب کا ہے۔ انٹرنیٹ نے تو معاملہ مزید آسان کر دیا ہے۔ بیشتر کتب اس پر موجود ہیں اور سیکنڈوں میں اس میں سے حسب منشا کوئی چیز تلاش بھی کی جا سکتی ہے۔

دوسری مثال لیں۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی، یونیورسٹی آف مینی سوٹا (University of Minnesota) کی انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ پر حقوق انسانی سے متعلق چھ ہزار سے زائد دستاویزات ہیں۔ جو ہمیں مکمل مفت مل جاتی ہیں۔ دیکھیں قانون اور سیاست کے ایک پہلو یعنی حقوق انسانی پر ایک یونیورسٹی نے ہوا میں اتنی کتابیں ہم سب کے لیے مفت رکھی ہیں۔

میں جب علما سے اس مسئلے پر بات کرتا ہوں تو سادہ سا جواب ملتا ہے کہ ہمارے وسائل نہیں ہیں۔ مجھے اس دلیل سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ مسجد پر اگر ہم ایک چھوٹا سا مینار بنا لیں۔ چار بڑے مینار نہ بنائیں تو اسی مسجد میں ایک چھوٹی سی لائبریری قائم ہو سکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسجد نبوی کے مینار نہ تھے۔ بیت اللہ شریف کے مینار نہ تھے۔ یہ بعد میں شناخت کے لیے بنے ہیں۔ کیا شناخت کے لیے ایک چھوٹا سا خوبصورت سا مینار کافی نہیں ہے؟ حج ایک فرض ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہر سال حج پر جاتے ہیں۔ فرض حج کے علاوہ ہر سال اربوں روپے ہم حج و عمرہ پر صرف کرتے ہیں کیا اس رقم کا استعمال لائبریری بنانے پر ہو سکتا ہے؟ حالانکہ تحصیل علم بہت اعلیٰ عبادت ہے۔ ہم عالم کی ایک رات عابد کی سو راتوں سے بہتر سمجھتے ہیں[1]۔ اس کو بھی چھوڑ دیں۔ آپ ایک سال میں غیر ضروری مذہبی جلسے جلوسوں پر اٹھنے والے اخراجات کا جائزہ لیں تو وہ کروڑوں میں ہوں گے جو ایک شاندار لائبریری بنانے کے لیے کافی ہیں۔

---

[1] کنزالعمال، ج:5، رقم الحدیث:4278

ہمارے بڑوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی تحقیق کی ہے۔کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ تیس جلدوں پر محیط کتاب المبسوط امام سرخسیؒ نے جیل کے اندر ایک کنویں میں بیٹھ کر لکھی ہے[۱]۔ جہاں انہیں زندگی کی کوئی سہولت حاصل نہ تھی اور نہ کسی اچھی لائبریری تک رسائی حاصل تھی۔ان کے پاس علم کی پیاس اور اپنے مقصد کی لگن تھی۔حضرت اقبالؒ صحیح فرماتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خُون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خُونِ جگر کے بغیر[۲]

(عظیم فن کسی آرام طلب فنکار کے اندر جنم نہیں لیتا۔ یہ آنسوؤں، اذیتوں اور ذہنی کاوشوں کا ثمر ہوتا ہے جو ہر اس سچے فنکار کی جھولی میں آ گرتا ہے جو انسانیت کے جذبے سے سرشار ہو)

اب وقت ہے کہ ہم گہری نیند سے اٹھیں۔اپنے سلیبس اور طرز تدریس کا جائزہ لیں۔کچھ مدارس نے پہلے ہی اس طرف توجہ کر لی ہے اور اپنے اندر بنیادی اور جوہری تبدیلیاں لائے ہیں۔
اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنی علمی میراث کو چھوڑ دیں یا اس کی اہمیت کم کر دیں۔ایسا کرنا ہماری تہذیبی اور علمی خودکشی ہوگی۔تجویز صرف اتنی ہے کہ ہم اپنی قدیم کتب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ غیر علما کی جدید کتب بھی پڑھیں۔تدریس کے فن میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان کو بھی استعمال کریں۔جدید سائنسی ذرائع کا بھی استعمال کریں۔عہد حاضر میں ابھرنے والے نئے مضامین (معاشیات، سیاسیات، نفسیات، عمرانیات، بشریات، جرح وفقہ وغیرہ) پر بھی توجہ

---

[۱] فرغانہ کے حاکم نے اپنی ایک کنیز کو آزاد کر کے عدت سے پہلے ہی اس سے نکاح کر لیا۔امام سرخسیؒ نے اس پر اعتراض کیا تو حاکم وقت نے انہیں ایک کنواں نما گھڑے میں قید کر دیا۔آپؒ کے شاگردوں کو اس واقعے کا بہت زیادہ دکھ ہوا۔انہوں نے اپنے استاد سے وابستگی کے لیے درخواست کی کہ ہم روزانہ اس کنویں کے منہ پر آجایا کریں گے۔آپؒ ہمیں کچھ املا کرا دیا کریں۔چنانچہ آپؒ نے اس کنویں سے اپنی عظیم کتاب المبسوط فی الفقہ املا کرانی شروع کی اور علم کی تاریخ کا یہ منفرد شاہکار کنویں نما قید خانے سے املا کروائی۔

[۲] بال جبریل: مسجد قرطبہ

کریں۔ اگر ہم عہد کی روح کو نہیں سمجھیں گے تو عہد ہمیں قبول نہیں کرے گا۔ ہم انسانی سفر میں پیچھے رہ جائیں گے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا، چلنا، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب — تارے، انساں، شجر، حجر سب
ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا
کہنے لگا چاند، ہم نشینو — اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

7

جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[۱]

بلاشبہ مسلمانوں نے یورپ سے پہلے دنیا کو تمام علوم وفنون میں گراں قدر سرمایہ عطا کیا لیکن پھر امت خرافات میں کھو گئی اور امتِ مسلمہ کی اس کاہلی اور غفلت نے بالآخر اسے مکافاتِ عمل سے دوچار کر کے چھوڑا۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثرّیا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا[۲]

مسلم تہذیب کو طرح طرح کے خطرات درپیش ہیں۔ یہ کوئی اچانک اور غیر متوقع امر نہیں تھا۔ اسے ہو کر ہی رہنا تھا کیونکہ مادی دنیا فطری قوانین کی تابعِ فرمان ہے۔ فطرت اپنے قوانین کو تبدیل نہیں کرتی۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا[۳].

(تم اللہ تعالیٰ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ[۴].

(حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی)

مسلمانوں نے ان قوانین کی اطاعت نہیں کی بلکہ ان قوانین سے سرکشی کی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان

---

[۱] علامہ محمد اقبالؒ

[۲] بانگ درا: خطاب بہ جوانان اسلام

[۳] سورۃ فاطر، آیت: 43

[۴] سورۃ الرعد، آیت: 11

کا سرغرور ٹوٹ کر پاتال میں جا گرا اور وہ تحت الثریٰ میں جا پہنچے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا:

1 تعلیمی پسماندگی

قرآن مجید میں بیان کردہ واقعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو شیطان (ابلیس) پر علم الاشیاء (مادی چیزوں کا علم) رکھنے کی وجہ سے برتری حاصل تھی۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ[1].

(اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتلائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ؟)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس کا آغاز 'اقراء' (پڑھو) سے ہوا تھا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ[2].

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا)

یہ واضح ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اسلامی روایت علم پر استوار ہے۔ اسلام میں علم پر اتنا زور دیئے جانے کی وجہ سے دنیا میں ایک فقید المثال ذہنی تحریک برپا ہوئی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی بنیاد اسلام کی مرہون منت ہے[3]۔ محمد اقبال نے بالکل بجا کہا:

---

[1] سورۃ البقرۃ، آیت: 31

[2] سورۃ العلق، آیات: 1-5

[3] دیکھیے باب: 3

عہد نو با جلوہ ہا آراستہ
از غبار پائے ما برخاستہ[۱]
(یہ جدید تہذیب جو حُسن اور شان و شوکت سے آراستہ ہے)
(ہمارے قدموں سے اٹھنے والی خاک سے نکلی ہے)

حضرت اقبالؒ کے اس بیان کو اسلامی تعلیمات کے اعلیٰ ترقی یافتہ قدیمی اداروں کی پُرزور تائید حاصل ہے۔ جامعہ قیروانیہ[۲] جس کی بنیاد 859ء میں فاطمہ الفہری[۳] اور اس کی ہمشیرہ مریم نے ڈالی تھی، جامعۃ الازہر جو 972ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں قانون، فلکیات، فلسفہ اور ادب کے شعبے تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں خواجہ نظام الملک نے متعدد جامعات قائم کیں: نظامیہ البغداد 1065ء میں قائم ہوئی۔ اسی طرح نظامیہ، طوس (ایران)، نیشاپور (ایران)، امول (ایران)، موصل (عراق)، ہرات (افغانستان)، دمشق (شام) اور بصرہ (عراق) میں قائم ہوئیں۔

جب مسلمانوں نے علمی مشاغل کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا، مغرب نے شمعِ علم کو آگے بڑھاتے ہوئے پورے یورپ میں یونیورسٹیوں کا جال بچھا دیا۔ انہوں نے 300 سال سے کچھ زائد عرصے میں یونیورسٹی آف بولوگنا (University of Bologna, 1088)، یونیورسٹی آف پیرس، فرانس (University of Paris, 1150)، یونیورسٹی آف آکسفورڈ (University of Oxford, 1167)، یونیورسٹی آف کیمبرج (University of Cambridge, 1209)

---

[۱] اسرار خودی: وقت سیف

[۲] جامعہ قرویین یا جامعہ قیروانیہ مراکش کے شہر فاس میں واقع ایک جامعہ ہے جسے ایک مسلمان دولت مند تاجر محمد الفہری کی بیٹی فاطمہ الفہری نے 859ء میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ جامعہ مسلم دنیا کے اہم تعلیمی مراکز میں سے ایک ہے اور گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز کے مطابق دنیا کی سب سے قدیم جامعہ ہے جہاں آج تک تعلیم دی جاتی ہے۔

[۳] فاطمہ الفہری (800ء-880ء) اور مریم الفہری ایک دولت مند عرب مسلم تاجر محمد الفہری کی بیٹیاں تھیں جنہوں نے مراکش کے شہر فاس میں 859ء میں جامعہ قیروانیہ تعمیر کروائی۔

، یونیورسٹی آف سلامانکا، سپین (University of Salamanca, 1218)، یونیورسٹی آف مانٹپلائر، فرانس (University of Montpellier, 1220)، یونیورسٹی آف نیپلز (University of Naples, 1222)، یونیورسٹی آف تلوز، فرانس (University of Toulouse, 1229)، یونیورسٹی آف روم لا سیپانڑے (University of Rome La Sapienze, 1303)، یونیورسٹی آف پیسا (University of Pisa, 1343)، یونیورسٹی آف ویانا (University of Vienna, 1365)، یونیورسٹی آف لپزنگ، جرمنی (University of Leipzing, Germany, 1409)، یونیورسٹی آف کاتانیا (University of Catania, 1434)، یونیورسٹی آف گلاسگو (University of Glasgow, 1451)، یونیورسٹی آف کوپن ہیگن (University of Copenhagen, 1479)، یونیورسٹی آف ایبرڈین (University of Aberdeen, 1494) میں قائم کر دیں۔ جبکہ یونیورسٹی آف پنجاب، پاکستان بھی ایک برطانوی مستشرق اور پادری جی ڈبلیولٹنر (G.W. Leitner) نے 1882ء میں قائم کی تھی۔

مسلمانوں میں شرح خواندگی کے حوالے سے درج ذیل حقائق توجہ طلب ہیں:

(i) آج مسلمان دنیا میں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ترین قوم ہیں۔

(ii) مسلم ممالک میں تعلیم کا معیار اور شرح خواندگی دنیا بھر سے کم ہے۔

(iii) دنیا میں اوسط شرح خواندگی 92 فیصد ہے جب کہ تنظیم اسلامی تعاون (OIC) کے مطابق ان ممالک میں اوسط شرح تعلیم بالغاں 72 فیصد ہے لیکن ذیلی صحرائی افریقہ اور جنوبی ایشیا میں یہ شرح مایوس کن حد تک کم ہے جو علی الترتیب 57 فیصد اور 55 فیصد ہے[1]۔

(iv) تنظیم اسلامی تعاون (OIC) کے ممالک کی مجموعی ملکی پیداوار (GDP) کا اوسطاً 2.7 فیصد تعلیم عامہ پر خرچ ہوتا ہے جبکہ عالمی سطح پر اس کا اوسط 4 فیصد ہے۔

[1] en.unesco.org

(v) اکیلے جاپان میں یونیورسٹیوں کی تعداد پوری مسلم دنیا کی یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے۔ وہاں 803 قومی، پبلک اور نجی یونیورسٹیاں ہیں۔(statista.com) پوری مسلم دنیا میں یونیورسٹیاں 1840 ہیں جبکہ بھارت میں یونیورسٹیوں کی تعداد 8407 اور امریکہ میں 5758 ہیں۔

(vi) ہارورڈ یونیورسٹی کا سالانہ بجٹ بہت سے اسلامی ممالک میں تعلیم پر خرچ ہونے والے مجموعی بجٹ سے زیادہ ہے۔

(vii) آکسفورڈ یونیورسٹی ایک سال میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں 57 مسلم ممالک کی کل یونیورسٹیوں سے زیادہ تعداد میں جاری کرتی ہے۔

(viii) 1.9 بلین مسلمانوں میں سے 300,000 سے بھی کم افراد سائنسدان بنتے ہیں۔ یہ تناسب فی ملین مسلمانوں میں سے 230 بنتا ہے۔ امریکہ (USA) میں 1.1 ملین سائنسدان (4099 فی ملین) جب کہ جاپان میں 700,000 (5095 فی ملین) ہے۔

(ix) مسلمان ممالک اپنے کل GDPs کا بہت کم حصہ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ انڈونیشیا (3.6 فیصد) پاکستان (2.5 فیصد)، بنگلہ دیش (1.3 فیصد)، نائیجریا (3.8 فیصد) خرچ کرتا ہے[1]۔

(x) تیونس واحد اسلامی ملک ہے جو اپنے کل GDP کا 7.3 فیصد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ یہ GDP فیصد کے حساب سے ان ممالک سے زیادہ ہے۔ جبکہ اسرائیل (6.1 فیصد)، فرانس (5.7 فیصد) اور برطانیہ (5.5 فیصد) سے زیادہ خرچ کر رہا ہے۔

(xi) تیونس اپنے GDP کا جو 7.2 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے وہ امریکہ کے 5.9 بلین ڈالر کے مساوی ہے۔ جبکہ فرانس اپنے GDP کا 5.7 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔ جو امریکہ کے 121.4 بلین ڈالر کے برابر ہے۔ یہ بات صاف ظاہر کرتی ہے کہ 'فیصد' ہرگز پوری کہانی نہیں سناتا۔ اس کیس میں فرانس تعلیمی شعبے میں تیونس سے 22 گنا زیادہ خرچ کر رہا ہے۔

(xii) 2022 کی اکیڈمک رینکنگ آف ورلڈ یورنیورسٹیز (ARWU) کے مطابق فرانس کے پاس

[1] data.worldbank.org

دنیا کی 500 ٹاپ یونیورسٹیوں میں سے 39 یونیورسٹیاں ہیں، ریپبلک آف کوریا کے پاس 8 اور اسرائیل کے پاس ایسی 6 یونیورسٹیاں ہیں جب کہ ترکی وہ واحد مسلمان ملک ہے جس کے پاس دنیا کی 500 ٹاپ یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی ہے[1]۔

(xiii) عالمی یونیورسٹیوں کی 'دی ٹائمز ہائر ایجوکیشن رینکنگ' میں آٹھ مسلمان ممالک (ترکی، ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات) شامل ہیں۔ ان کے پاس 500 ورلڈ کلاس یونیورسٹیوں میں سے صرف 18 یونیورسٹیاں ہیں۔

(xiv) یونیسکو کے مطابق تیسرے درجے (ثانوی تعلیم کے بعد) کے علمی اداروں میں داخلے کی سب سے زیادہ شرح (53 فیصد) قازقستان میں ہے۔ جس کے بعد ایران اور ترکی (35 فیصد)، تیونس اور سعودی عرب (31 فیصد)، نائجر، برکینا فاسو اور افغانستان میں 2.5 فیصد سے کم ہے۔ جنوبی کوریا، برطانیہ، اسرائیل اور فرانس میں تیسرے درجے کی سطح میں داخلے کی شرح علی الترتیب 93 فیصد، 59 فیصد، 58 فیصد اور 56 فیصد ہے۔

(xv) بیشتر مسلم ممالک میں استاد شاگرد کا تناسب پرائمری سطح پر سب سے زیادہ ہے۔ مالی میں یہ تناسب 56 شاگرد فی استاد تک جا پہنچتا ہے۔ برکینا فاسو میں 46، گنی میں 45، نائیجر میں 40، پاکستان اور سینیگال میں ایک استاد کے لیے 39 شاگرد ہیں۔ اس سے بالکل برعکس صورت حال یہ ہے کہ اسرائیل میں ایک استاد کے لیے 14 شاگرد (1:14)، برطانیہ اور فرانس میں یہ تناسب 1:18 ہے جب کہ جنوبی کوریا میں پرائمری سکول میں ہر استاد کو صرف 26 طلبا کو پڑھانا ہوتا ہے۔

افراد پر تعلیم کے اثرات اور ان کے کامیابی کے اعلیٰ ترین سطح پر پہنچنے کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو آیئے ہم نوبیل پرائز جیتنے والوں میں مسلمانوں اور مسلم ممالک میں رہنے والوں اور یہودیوں کے تناسب کا ملاحظہ کرتے ہیں:

[1] www.timeshighereducation.com

ادب (Literature)

1905ء سے لے کر 2021ء تک کل پندرہ (15) یہودیوں نے نوبل پرائز حاصل کیے ہیں جبکہ پوری مسلمان دنیا میں سے صرف دو (2) افراد نجیب محفوظ (1988ء) اور اور خان پاموک (2006ء) نے نوبل پرائز حاصل کیے ہیں۔

امن (Peace)

کل نو (9) یہودیوں نے نوبل انعام حاصل کیے ہیں جبکہ سات (7) مسلمانوں نے نوبل انعام حاصل کیا ہے جن کے نام یہ ہیں: انور السادات (1978ء)، یاسر عرفات (1994ء)، شیریں عبادی (2003ء)، محمد البرادی (2005ء)، محمد یونس (2006ء)، توکل کرمان (2011ء) اور ملالہ یوسف زئی (2014ء)

کیمیا (Chemistry)

کیمیا میں کل چھتیس (36) یہودیوں نے نوبل انعام حاصل کیا ہے جبکہ کل دو (2) مسلمانوں احمد زیویل (1999ء) اور عزیز سنکار (2015ء) نے نوبل انعام حاصل کیا ہے

اقتصادیات (Economics)

اکنامکس میں کل پنتیس (35) یہودیوں نے نوبل انعام حاصل کیا ہے جبکہ مسلمانوں میں سے کسی نے بھی 2022ء تک اقتصادیات میں نوبل انعام حاصل نہیں کیا۔

فزیالوجی/میڈیسن (Physiology/Medicine)

میڈیسن میں کل 57 یہودیوں نے نوبل انعام حاصل کیا ہے جبکہ مسلمانوں میں سے کسی نے بھی 2022ء تک اس شعبہ میں نوبل انعام حاصل نہیں کیا۔

طبیعیات (Physics)

طبیعیات میں کسی بھی مسلمان نے نوبل انعام حاصل نہیں کیا۔ مسلمان ممالک میں سے صرف

ڈاکٹر عبدالسلام (1979ء) قادیانی (غیر مسلم) نے نوبل انعام حاصل کیا ہے جبکہ 58 یہودیوں نے طبیعیات میں نوبل انعام حاصل کیا ہے۔

نوبیل پرائز ایک سالانہ بین الاقوامی انعام ہے جو سب سے پہلے 1901ء میں فزکس، کیمسٹری، فزیالوجی، میڈیسن، لٹریچر اور امن کے سلسلے میں بہترین کارناموں پر دیا گیا تھا۔ اکنامکس پر یہ 1969ء سے دیا جا رہا ہے۔ نوبیل انعامات 860 سے زائد افراد کو دیا گیا ہے۔ ان میں سے کم سے کم 22.4 فیصد یہودی ہیں باوجود اس حقیقت کے کہ وہ دنیا کی کل آبادی کا 0.2 فیصد سے بھی کم ہیں۔ مجموعی طور پر انہوں نے اکنامکس میں 35 فیصد، میڈیسن میں 39.5 فیصد، فزکس میں 25.2 فیصد، کیمسٹری میں 27.3 فیصد، لٹریچر میں 18 فیصد اور شعبۂ امن میں 12.8 فیصد یہ انعامات حاصل کئے[1]۔ یہودیوں نے چھ کے چھ زمروں میں یہ انعامات پائے۔ دوسری جانب ایک پاکستانی عبدالسلام نے فزکس میں یہ انعام پایا۔ اس کا تعلق قادیانی / احمدی فرقے سے تھا جس کو 1974ء میں پاکستان کی پارلیمان غیر مسلم قرار دے چکی ہے۔ احمد زیول (مصر) اور عزیز سنکر (ترکی)، مسلم دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر انہوں نے تعلیم اور تحقیق کا کام امریکہ میں کیا ہے۔ مزید برآں دیگر نوبیل انعام یافتہ مسلمان عامۃ المسلمین کی نظر میں غیر عملی قسم کے مسلمان ہیں۔

2 غربت

مسلمانوں کے اقتصادی حالات افسوناک حد تک خراب ہیں۔ 'تنظیم برائے اسلامی تعاون' (OIC) کی معیشت 57 ممالک کی معیشتوں کا مجموعہ ہے جن میں سے 53 ممالک زیادہ تر مسلم ریاستیں ہیں دیگر 8 ممالک میں کافی بڑی مسلم اقلیتیں ہیں۔ ان 57 ملکوں کا مجموعی GDP at Purchasing Power Parity: PPP 7.7 کھرب امریکی ڈالر ہے۔ جاپان کا GDP 4.7 کھرب امریکی ڈالر ہے۔ امریکہ (US) کا 18.7، GDP کھرب ڈالر ہے اور چین کا GDP, 16 کھرب امریکی ڈالر ہے۔

---

[1] یہ حقائق 2016ء تک کے ہیں

پاکستان اور افغانستان کی فی کس آمدنی تقریباً علی الترتیب 5000 (امریکی) ڈالر اور 1900 (امریکی) ڈالر ہے۔ جب کہ سنگاپور اور سوئٹزرلینڈ کی فی کس آمدنی علی الترتیب 83000 (امریکی) ڈالر اور 53000 (امریکی) ڈالر ہے۔

3 صحت

مسلم دنیا میں 'متوقع انسانی عمر' (life expectancy) 50 برس ہے جبکہ جاپان اور فرانس میں یہ عمر 80 برس ہے۔ ملاوی میں 43 برس اور افغانستان میں 51 برس ہے۔ مغرب نے سائنسی اور طبی ترقی کی بدولت عمر کو طوالت دینے اور موت کے امکانات کو کم کرنے میں کافی کامیابیاں حاصل کر لی ہیں جبکہ بہت سے مسلمان مناسب علاج معالجے سے بے نیاز ہو کر 'راضی بہ رضائے مولیٰ' ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مناسب علاج کرانا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ زندگی خالقِ ارض وسما کی دی ہوئی ایک امانت ہے اس کی کما حقہ، حفاظت کی جانی چاہیے۔ مسلمانوں کو درج ذیل حقائق پر لازماً غور وفکر کرنا چاہیے۔

(i) مسلم ممالک کے صحت پر اخراجات ان کے GDP کے لحاظ سے فیصد تناسب، دنیا کے اوسط کے تقریباً نصف ہیں۔

(ii) مسلم دنیا کے تقریباً 30 لاکھ افراد ہر سال ٹی بی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں سے نصف موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

(iii) پانچ مسلم ممالک افغانستان، پاکستان، نائیجریا، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش دنیا کی ان 22 قوموں میں شامل ہیں جن میں ٹی بی کی بیماری سب سے زیادہ پھیلتی ہے۔

(iv) اگر ہم اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے اشاریئے 'HDI' پر نظر ڈالیں تو ترقی یافتہ ممالک ناروے، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور نیدرلینڈ اپنے شہریوں کو اعلیٰ ترین درجے کا معیار زندگی فراہم کرتے ہیں۔ جہاں اوسط 'HDI' اشاریہ 0.93 ہے۔ امریکہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور سنگاپور کا 'HDI' ان سے ذرا نیچے 0.90 ہے۔ اس فہرست میں اسرائیل

18 ویں نمبر پر قطر 32 ویں نمبر پر، سعودی عرب 39 ویں، متحدہ عرب امارات 41 ویں اور کویت 48 ویں نمبر پر ہے۔

(v) ایک مسلمان ملک بھی ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنے شہریوں کو 'HDI' کے شمار (کاؤنٹ) کے اوسط سے کچھ زائد دیتا ہے۔ اگرچہ چھوٹی ریاستیں قطر اور کویت وافر وسائل رکھتی ہیں۔

(vi) یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں جن ممالک کا 'HDI' کاؤنٹ سب سے کم ہے ان میں سے زیادہ تر مسلمان ممالک ہیں۔ پاکستان اس فہرست میں ایک بدقسمت اندراج والا ملک ہے، جس کی 'HDI' 0.538 فیصد ہے اور یہ افغانستان، سوڈان، نائیجریا، مالی اور سیرا الیون کا ہمرکاب ہے۔

(vii) ان زیادہ تر نچلے 'HDI' والے مسلم ممالک میں متوقع زندگی 62 سال کے اردگرد گھومتی ہے جب کہ سرفہرست 10 ممالک میں اوسط عمر 80 سال تک ہو چکی ہے۔

(viii) صنعتی ترقیاتی اشاریئے کے لحاظ سے مسلم ممالک میں قطر 32 ویں نمبر پر ہے جبکہ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور اردن اس سے ذرا قریب ہیں۔ تاہم حسبِ توقع بیشتر مسلمان ممالک 188 ملکوں کی اس فہرست میں بنگلہ دیش کے ہمراہ 142 ویں، پاکستان 147 ویں، افغانستان 171 ویں اور سیرا الیون 181 ویں نمبر پر ہیں۔

4 تحقیق و ترقی

مسلم ممالک میں تحقیق و ترقی کی صورتِ حال بھی حوصلہ افزا نہیں رہی ہے۔ جس کی عکاسی درج ذیل حقائق سے ہوتی ہے۔

(i) کسی ملک کے مستقبل میں ترقی سے ہمکنار ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس نے تحقیق و ترقی (Research and Development) پر کتنی رقم خرچ کی ہے۔ 80 فیصد ترقی یافتہ ممالک اس کام پر کم و بیش خرچ کرتے ہیں۔ ان میں سے امریکہ 33.5 فیصد، یورپ 23.5 فیصد اور جاپان 13.4 فیصد خرچ کرتا ہے۔

(ii) عالمی سطح پر 2010ء میں تحقیق وترقی پر مجموعی طور پر ایک کھرب ڈالرز خرچ ہوئے سرفہرست رہنے والے 10 ممالک میں سے امریکہ نے 667 بلین (ارب) جبکہ چین نے 370 ارب ڈالر خرچ کیے[۱]۔

(iii) ترکی 15.9 بلین اور پاکستان 2.4 بلین خرچ کرتا ہے۔ تیل کی بدولت سے مالا مال ملک سعودی عرب تحقیق وترقی پر صرف 1.8 ارب ڈالر حقیر رقم خرچ کرتا ہے[۲]۔

(iv) اوسطاً صرف 649 مسلم محقق فی دس لاکھ (ملین) آبادی ہیں۔

(v) یہ اعداد و شمار اس وقت مزید پریشان کن دکھائی دیتے ہیں جب ان کا موازنہ یورپ سے کیا جائے جہاں فی ملین آبادی میں اوسطاً 6494 محققین ہیں۔

(vi) تنظیم برائے اسلامی تعاون (OIC) کی رپورٹ ہے کہ اس میں محققین کی کل تعداد میں سے خواتین تقریباً 26.8 فیصد ہیں۔ جب کہ عالمی سطح پر یہ اوسط 33.3 فیصد اور یورپ میں 32.8 فیصد بنتی ہے۔

5 عسکری کمزوری

مسلمانوں کو قرآن کریم[۳] نے حکم دیا ہے کہ وہ خود کو تیار رکھیں اور اتنی قوت جمع کرتے رہیں کہ اپنے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں جبکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ اس وقت ہم دنیا کی کمزور ترین امت ہیں[۴]۔ جیسا کہ ہم افغانستان کو تباہ ہوتے دیکھتے رہے ہیں اگرچہ بعض لوگوں کے قریب یہ ایک صحیح اسلامی ریاست تھی پھر اسے کیا ہوا؟ ذرا 'تورا بورا' کو دیکھ لیجئے۔ پہاڑوں تک کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ افغانستان کے بعد لیبیا، عراق اور شام بھی تباہ ہو گئے۔ یہ سب اکیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوا ہے۔

---

[۱] www.royalo. country.org

[۲] www. sesrtaic.org

[۳] سورۃ الانفال، آیت: 60

[۴] امریکہ کا سالانہ دفاعی بجٹ 640 بلین ڈالر ہے جبکہ تمام مسلم ممالک کا مجموعی دفاعی بجٹ بھی اس کا صرف نصف بنتا ہے۔

عراق میں مسلمانوں کے بعض مقدس مقامات ہیں: ان میں روضہ ہائے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ شامل ہیں۔ حالیہ برسوں میں غیر ملکی افواج نے اس ملک کو اپنے قدموں تلے روندا اور ہمارے مقدس مقامات کو برباد کر کے رکھ دیا۔ مسلم ممالک نے امریکیوں کے حملے کی صرف زبانی کلامی مذمت کی۔ تنظیم برائے اسلامی تعاون (OIC) نے اس حملے کی مخالفت میں چند قراردادیں منظور کیں، جو بالکل بے اثر رہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس کانفرنس کے چند رکن ممالک نے عراق پر حملے کے لیے اپنے اڈے تک فراہم کر دیئے۔ ذیل کے اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے صورت حال مزید واضح ہو جائے گی۔

(i) دنیا کے دس سرفہرست ممالک ہر سال مجموعی طور پر 1100 بلین ڈالر دفاع پر خرچ کرتے ہیں۔ ان میں سب سے آگے امریکہ ہے جو 598 بلین ڈالر اور اس کے بعد دوسرے نمبر پر چین ہے جو 215 بلین ڈالر خرچ کرتا ہے۔ اس فہرست میں سعودی عرب واحد مسلم ملک ہے جو اپنی افواج پر 87 بلین ڈالر خرچ کرتا ہے۔

(ii) فوجی قوت بہ لحاظ مہارت اور عملیاتی کارکردگی ایک خاص حد تک ان اخراجات کی عکاسی کرتی ہے جبکہ امریکہ، چین اور روس آگے آگے ہیں۔ تاہم مسلم دنیا میں پاکستان بمشکل ہی اس فہرست میں آتا ہے جبکہ سعودی فوج اپنے بے پناہ بجٹ کے باوجود اس کی اہل شمار نہیں ہوتی۔

(iii) ٹینکوں کی لڑائی ہو تو روس کے پاس یہ 22,710 ہیں۔ اس لیے وہ دنیا میں اس شعبے میں اول نمبر پر ہے جبکہ امریکہ اور چین کے پاس 9، 9 ہزار ٹینک ہیں۔ مسلم ممالک میں سے شام کے پاس 4750، مصر کے پاس 4145، پاکستان کے پاس 4000 اور ترکی کے پاس 3760 ٹینکس ہیں۔ مسلمان ملکوں کی جنگی ضروریات اس امر کی متقاضی ہیں کہ ان کے ٹینک تعداد اور معیار کے لحاظ سے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے ہم پلہ ہوں۔ ان ممالک نے یہ معیار ایسے طاقتور آپریشنل یونٹوں کے ذریعے حاصل کیا ہے جو بے حد مستعد، تیز رفتار اور ہیبت ناک ہیں کیونکہ ان کی بنیاد فنیاتی برتری اور اختراع پسندی پر رکھی گئی ہے۔

(iv) مسلمان ملکوں کی فوجیں عشروں پرانے لڑاکا طیاروں کو گھسیٹے جا رہی ہیں جبکہ جدید فوجیں اور ان کی

فضائی افواج جست لگا کر بغیر پائلٹ پرواز کرنے والے طیاروں تک جا پہنچی ہیں۔ انہوں نے دکھائی نہ دینے والے پھرتیلے طیاروں کے ذریعے طویل دورانیہ کی صلاحیت اور انتہائی درست نشانہ بازی کے نئے نئے ریکارڈ قائم کر لیے ہیں۔

6 سیاسی جبر و تشدد

آیئے اب مسلم دنیا کے سیاسی نظاموں پر ایک نظر ڈالیں۔ ایک بھی ایسا مسلمان ملک نہیں ہے جس کا سیاسی ڈھانچہ مکمل طور پر 'شوریٰ' (باہمی مشاورت) پر استوار ہو۔

مسلمان ممالک میں جہاں بھی اسلام کے نام پر حکومت بنی، انہوں نے بعض سخت گیر احکامات دیئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ ظلم سے ظلم جنم لیتا ہے۔ افغانستان میں کمال درجے کی بے اعتنائی کے ساتھ کسی ایک مذہبی اقلیت کے مذہبی آثار تباہ کئے۔ یہ بودھ مت کی وہ باقیات تھیں جو ہزاروں سال سے صوبہ بامیان میں ایستادہ تھیں۔ دنیا بھر نے اس توڑ پھوڑ کی شدید مذمت کی مگر کسی کی نہ سنی۔ انہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ افغانستان کو خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتح کیا گیا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ میں سے تھے جنہوں نے کعبے میں بتوں کو توڑا تھا۔ لیکن یہاں انہوں نے بودھ مت کے ان مذہبی آثار کو تباہ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ سلطان محمود غزنوی[1] جسے بُت شکن کہا جاتا تھا وہ اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہزاروں میل کا سفر کر کے سومناتھ (جنوبی ہندوستان کا ایک شہر) کے بت توڑے لیکن قریب رکھے بودھ کے مجسموں کو ہاتھ نہیں لگایا۔

مسلمانوں کا نظریۂ اسلام غیر منطقی ہے۔ انہیں نہ تو تاریخ کا شعور ہے اور نہ اقلیتوں کے حقوق کا کوئی پاس۔ وہ سیرت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی صحیح طور پر واقف نہیں ہیں۔ ان کا تصور اسلام قبائلی اور زرعی اور صحرائی سوچ کے مطابق ہے جو عہد حاضر میں انسانیت کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقت کے سیاسی اور سماجی غاروں میں دفن ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تصورِ اسلام امتِ مسلمہ پر

---

[1] یمین الدولہ محمود المعروف سلطان محمود غزنویؒ (971ء–1030ء) سلطنت غزنویہ کا حکمران تھا جو 997ء سے 1030ء تک برسر اقتدار رہا۔ اس کی وسیع سلطنت میں موجودہ مکمل افغانستان، ایران، پاکستان کے کئی حصے اور شمال مغربی بھارت شامل تھا۔

کاری ضرب لگا جاتا ہے۔ مصر، الجزائر، افغانستان، عراق، شام اور پاکستان میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

باوجود اس حقیقت کے کہ امتِ مسلمہ سیاسی دباؤ، استبداد (tyranny) اور غیر معقولیت میں سے گزر رہی ہے۔ ہمارے ہاں عوامی حاکمیت اعلیٰ (popular sovereignty) یا روشن خیالی (enlightenment) کے قیام کے لیے کوئی موزوں علمی یا سیاسی تحریکیں نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ جو جماعتیں اور گروہ تبدیلی کے متمنی ہیں وہ انفرادی آزادیوں کے مخالف اور فرقہ پرست ہیں۔ ان کے فلسفے غیر معقول (irrational)، بے بہرہ از تاریخ (anachronistic) اور دشمن معقولیت (obscurantist) ہیں۔ وہ عوام کو روشنی، امن اور خوشحالی کی طرف لے جانے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔ علامہ محمد اقبالؒ اس بارے میں فرماتے ہیں:

قافلۂ حجاز میں ایک حسین رضی اللہ عنہ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات[1]

'اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ' (The Economist Intelligence Unit) نے ایک 'جمہوری اشاریہ' تیار کیا ہے جو 167 ممالک میں کیفیاتِ جمہوریت کو ناپتا ہے۔ یہ اشاریہ '60' نشانات پر مبنی ہے جو پانچ مختلف زمروں میں منقسم ہے۔ یہ دیگر عوامل کے علاوہ تکثیریت (pluralism)، شہری حقوق، سیاسی کلچر کی بنا پر بھی فیصلے کرتا ہے۔ اس فہرست میں پہلے 20 ممالک میں ایک بھی مسلمان ملک شامل نہیں۔ انڈونیشیا انچاسویں، تیونس 57 ویں، سینیگال 75 ویں، البانیہ 81 ویں، بنگلہ دیش 86 ویں، ترکی 97 ویں، مراکش 107 ویں، پاکستان 112 ویں، الجزائر 118 ویں، کویت 121 ویں، قطر 134 ویں، سوڈان 151 ویں اور شام 166 ویں نمبر پر ہے۔ اگر کہیں اسلام کے نام پر سیاسی نظام بنا تو وہ بھی مکمل عدل پر نہ بنا سکا۔ ایران، عراق، مصر اور افغانستان اس کی مثالیں ہیں۔

---

[1] بال جبریل: ذوق وشوق

حوالہ جات

1 بال جبریل، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: تاج کمپنی، 1935ء۔

2 پیام مشرق، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: شیخ مبارک علی، 1923ء۔

3 تاریخ الامم والملوک: تاریخ طبری، امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ ترجمہ ڈاکٹر محمد صدیق ہاشمی۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، 2004ء۔

4 زادالمعاد، حافظ ابوعبداللہ بن قیم جوزیؒ۔ دارالسلام، لندن، 2003ء۔

5 سنن ابو داوًد، امام ابوداوًد سلیمان بن اشعت سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، 2008ء۔

6 صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داوًد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، 2004ء۔

7 صحیح مسلم، امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج نیشاپوری ترجمہ علامہ وحیدالزمان۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، 2004ء۔

8 ضرب کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: کتب خانہ طلوع اسلام، 1936ء۔

9 کشف المحجوب، حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ منقولہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ترجمہ ایف ڈی گوہر۔ لاہور: احمد ربانی ایم اے، 1972ء۔

10 مشکوٰۃ المصابیح، حضرت شیخ ولی الدین الخطیب التبریزیؒ ترجمہ مولانا محمد صادق خلیلؒ۔ لاہور: مکتبہ محمدیہ، 2005ء۔

11 نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض۔ لاہور: فرید بک، 2010ء۔

12 A History of Industrial Chemistry by F. S. Taylor. London: Heinmann, 1957.

13 A History of Muslim Philosophy by M. M. Sharif. Otto Harrassowitz: Kempten, 1963.

14 A Study of History: Abridgement of Volumes I to VI. by A. J. Toynbee. New York: Oxford University Press, 1947.

15 al-Ghazali: The Mystic by Margaret Smith. London: Luzac & Co., 1946.

16 Arabian Medicine and Its Influence on the Middle Ages by D. Campbell. London: Routledge, 2000.

17 Dictionary of Scientific Biography by W. Hartner. New York: Charles Scribner's Sons, 1970

18 Early Arabic Pharmacology: An Introduction Based on Ancient and Medieval Sources by M. Levey. Leiden: Brill, 1973.

19 Encyclopedia Britannica. Chicago: The University of Chicago, 1988.

20 Historical Eclipses and Earth's Rotation by F. Richard Stephenson. New York: Cambridge University Press, 1997.

21 Historical Facts for the Arabian Musical Influence by Henry George Farmer. London: Ayer Publishing, 1988.

22 History of Project Management by Y. Chiu. Netherlands: Eburon Press, 2010.

23 Introduction to Islamic Civilisation by R. M. Savory. New Dehli: Vikas, 1980.

24 Introduction to the History of Science by Goerge Sarton. New York: Huntington, 1975.

25 Islam and Divine Comedy by M. A. Palacios. London: Frank & Cass, 1968.

26 Makers of Chemistry by E. Holmyard. Oxford: Clarendon Press, 1931.

27 Mathematical Geography by E. S. Kennedy. Routledge, 1996.

28 Nozhat Al Mushtak fi Ikhtrak Al-Afak by al Idrisi. Romae in Typographia Medicea, 1592.

29 Papermaking: The History and Technique of an Ancient Craft by Dard Hunter. New York: Dover Books, 1978.

30 Science and Medicine in the Legacy of Islam by M. Meyerhof. London: Oxford University Press, 1931.

31 Science and Technology in Islam, The Touch of Midas by M. A. Kettani. Manchester: Manchester University Press, 1984.

32 Studies in Medieval Islamic Technology: From Philo to al-Jazari - from Alexandria to Diyar Bakr by D. R. Hill. London: Routledge, 1998.

33 The Arabic Hegemony: A History of Mathematics by C. B. Boyer. John Wiley & Sons, 1991.

34 The Arabs: A Short History by Philip Hitti. London: Macmillan, 2000.

35 The Crest of the Peacock: Non-European Roots of Mathematics by George Gheverghese Joeph. London: Princeton University Press, 2010.

36 The History of Western Philosophy by Bertrand Russell. London: G.Allen & Unwin Ltd.Segal, A. (1996, June). Why Does the Muslim World Lag in Science? The Middle East Quarterly, 3(2), 61-70.

37 The Impact of Science on Soceity by Bertrand Russell. London: Routledge Taylor & Francis Group, 1976.

38 The Making of Humanity by R. Briffault. London: G.Allen &

Unwin Ltd, n.d.

39 The Story of Civilization by W. J. Durant. New York: MJF Books, 1993.

40 https://en.wikipedia.org/wiki/Islamic_contributions_to_Medieval_Europe

41 http://www-history.mcs.st-andrews.ac.uk/Biographies/Al-Jayyani.html

42 https://www.jstor.org/stable/230255?seq=1#page_scan_tab_contents

43 https://www.wsfcs.k12.nc.us/cms/lib/NC01001395/Centricity/Domain/8062/watson_AAR_and_its_diffusion.pdf

ظفراللہ خان نے ابتدائی دینی و دنیاوی تعلیم صوفیائے کرام کے شہر ملتان میں حاصل کی۔ وفاق المدارس الدینیہ سے الشہادۃ العالمیہ فی العلوم الاسلامیہ کیا۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی (بین الاقوامی تعلقات) کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں تدریس کے شعبے سے منسلک رہنے کے بعد، سول سروس آف پاکستان کے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ (1987ء) میں شمولیت اختیار کر لی۔ سٹی یونیورسٹی لندن (1997ء) سے ایل ایل بی کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ یونیورسٹی آف ویسٹ آف انگلینڈ، برسٹل (برطانیہ) سے قانون میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کیا اور لنکنز ان (1998ء) سے بار ایٹ لاء کرنے کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے کر (2002ء) قانون کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ ہیگ (ہالینڈ)، تورین (اٹلی)، جنیوا (سوئزرلینڈ) اور آکسفورڈ (برطانیہ) سے قانون اور بین الاقوامی تعلقات پر کئی خصوصی کورسز کئے۔ وفاقی سیکریٹری برائے قانون و انصاف اور وزیراعظم پاکستان کے خصوصی معاون/ وفاقی وزیر برائے قانون و انصاف، وزیر برائے حقوق انسانی، وزیر برائے اقتصادی امور، وزیر برائے کابینہ اور وزیر برائے پارلیمانی امور بھی رہے۔ آپ اسلام، قانون اور حقوق انسانی پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

الکریم مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور فون: 042-37230350